ماہنامہ

اشراق

لاہور

جون ۲۰۲۴ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

طالب محسن

مدیر انتظامی

جواد احمد غامدی

1979 سے جاری شدہ

اشاعت کے 45 سال

”دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔“

—— شذرات

- قربانی کا مقصد... اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام واخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ (شذرات)
- اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے بندوں کی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے اُنھیں سخت ترین آزمایشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تاہم یہ آزمایشیں ایک حد سے متجاوز نہیں ہوتیں اور جو چیز اِن سے نجات کا باعث بنتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت ہی ہے۔ (قرآنیات)
- ہر دور میں ایمانیات کے فہم اور ان کے تقاضوں کے ادراک اور شریعت کے فہم اور اس کے اطلاق کو نئے حالات اور نئے سوالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں ایسے اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے ان حالات اور ان سوالات کا مواجہہ کیا۔ (شذرات)
- انسان کی تربیت واصلاح میں سب سے زیادہ موثر کام انفاق میں سرگرم ہونا ہے۔ چنانچہ جو خدا کی رضا اور قرب کا طالب ہو، اُسے چاہیے کہ وہ خدا کی پسند کے کام، خاص کر انفاق زیادہ سے زیادہ کیا کرے۔ (اصلاح ودعوت)

المورد

ادارۂ علم وتحقیق

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلّم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

ماہنامہ
اشراق
لاہور

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

مدیر
طالب محسن

مدیر انتظامی
جواد احمد غامدی

جلد ۳۶ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۴ء ذوالقعدہ/ذوالحجہ ۱۴۴۵ھ

فہرست

شذرات		
قربانی	جاوید احمد غامدی	۴
غلطی کا تعین	طالب محسن	۶
قرآنیات		
البیان: صٓ ۳۸: ۴۱-۸۸ (۴)	جاوید احمد غامدی	۱۰
معارف نبوی		
یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں خبر دینا	جاوید احمد غامدی/ محمد رفیع مفتی/ محسن ممتاز	۱۹
مقالات		
’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟ (۳)	ساجد حمید	۳۳
سیر و سوانح		
مہاجرین حبشہ (۳۱)	محمد وسیم اختر مفتی	۴۲
اصلاح و دعوت		
توبہ (۳)	محمد رفیع مفتی	۵۰
کفر و شرک —— ایک کردار	محمد ذکوان ندوی	۵۸
نقطۂ نظر		
ایک غلط فہمی	کوکب شہزاد	۶۰
یسئلون		
علم اور اس کے ذرائع	معاذ بن نور	۷۱
سجادین	شاہد رضا	۷۶
شخصیات		
حیات امین احسن (۹)	محمد بلال	۷۹

مجلس علمی

ڈاکٹر منیر احمد
طالب محسن
ڈاکٹر عبید الرحمٰن
ڈاکٹر شہزاد سلیم
ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر
اظہار احمد
جنید حسن
محمد رفیع مفتی
محمد وسیم اختر مفتی
ڈاکٹر ساجد حمید
آصف افتخار
خورشید احمد ندیم
کوکب شہزاد
مشفق سلطان

مجلس ادارت

شاہد رضا | نعیم احمد

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
https://www.javedahmedghamidi.org/#!/ishraq
https://www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
https://www.facebook.com/monthlyishraq

جاوید احمد غامدی

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے، جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

قربانی کی تاریخ

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔

یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب پشت بہ پشت لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عیدالاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے

اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

قربانی کا مقصد

اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔

یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسۡمِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكۡبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

قربانی کا قانون

اِس کا قانون یہ ہے:

قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔

اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔

قربانی کا وقت یوم النحر ۱۰/ ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں 'ایام تشریق' کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔ اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔

قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

(الاسلام ۱۱۹- ۱۲۲)

طالب محسن

غلطی کا تعین

اسلامی علوم اور اسلامی فکر نے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ دین بنیادی طور پر ایمان و عمل سے مرکب ہے، لیکن جب وہ انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہوتا ہے تو فہم و اطلاق کے بہت سے حل طلب سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی صدیوں ہی سے تعبیر و تشریح کا عمل شروع ہوا اور اختلاف و اتفاق کے فطری اسباب کے تحت مختلف مکاتب فکر بننے لگے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ماخذ کا مسئلہ نہیں تھا۔ آپ نے جسے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا، وہ دین قرار پایا۔ آپ نے جس کے بارے میں فرمادیا کہ یہ اللہ کی کتاب کی آیات ہیں، وہ کتاب الٰہی کی حیثیت سے ممتاز ہو گیا، لیکن آپ کے بعد قطعی اور ظنی ماخذ اور قرآن اور سنت کے تعلق کے سوالات موضوع بحث بنے اور آج تک قلم و قرطاس کے ہم کنار ہونے کا ایک سبب ہیں۔

اس امت کے ہر دور میں ایمانیات کے فہم اور ان کے تقاضوں کے ادراک اور شریعت کے فہم اور اس کے اطلاق کو نئے حالات اور نئے سوالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ ہر زمانے میں ایسے اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے ان حالات اور ان سوالات کا مواجہہ کیا۔ ان کے کام کو پذیرائی بھی ملی اور تردید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ سوالات اگر حقیقی ہوں تو وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور خامہ فرسائی کا محرک بنے رہتے ہیں۔

دین کیا ہے؟ یہ سوال مشمولات کے حوالے سے بھی فکر و نظر کے لیے تحریک عمل رہا ہے اور دین کے بحیثیت کل اہداف کے تعین کے تعلق سے بھی نظریہ سازی کا باعث بنا ہے۔ یہ سوال دین کی حکمتوں اور مصالح کو طے کرنے میں بھی علمی جدال کی علت رہا ہے۔ اسی طرح دین کے ساتھ تعلق کے تقاضوں کے بیان میں بھی

آرا کے تفاوت کا مبنیٰ بنتا ہے۔

جب بھی کوئی علمی کام ہوتا ہے تو وہ آنے والوں کے لیے کچھ سوالات کو حل کر دیتا ہے اور کچھ اشکال عقدہ کشائی کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ صورت معاملہ اصول و مبادی، قیاس و استنباط اور تعبیر و تشریح، ہر دائرے میں تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ ہر دور کا اختتام آنے والوں کے لیے فکر و نظر اور نقد و تنقیح کے نئے در بھی کھولتا ہے اور قدم جما کر آگے چلنے کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

علمی کام الٰہیات میں ہو، شریعت میں ہو، ان کی تفہیم میں ہو، ان کی حکمتوں میں ہو، ان کے مقاصد میں ہو، نفس انسانی کے ان سے تعلق میں ہو، دنیا میں ان کے کردار کے تعین میں ہو، مسلمانوں کی انفرادی یا اجتماعی ذمہ داریوں کے طے کرنے میں ہو، ان کو ایک کلی کے طور پر دیکھنے میں ہو، غرض دین کے کسی بھی پہلو سے کام ہو، مبنائے استدلال نصوص ہیں یا عقلی مقدمات ہیں یا قیاس و استنباط کے قواعد و ضوابط۔

اگر نصوص کی بنیاد پر رائے قائم ہوتی ہے تو وہ وہاں بھی لسانی اور منطقی دلائل ہوتے ہیں، جو کسی رائے کی بنیاد بنتے ہیں۔ اختلاف کرنے والا یا لسانی دلائل سے اسے ناقابل قبول قرار دے گا یا منطقی دلائل سے۔ یہاں یہ بحث بے معنی ہے کہ یہ رائے فقہا کے اجماع کے خلاف ہے یا اس سے پہلے یہ رائے کیوں قائم نہیں ہوئی یا اس رائے کے قائم کرنے میں اسباب باہر سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ باتیں بظاہر دلیل لگتی ہیں، لیکن حقیقتاً یہ دلائل کی مشقت اٹھانے سے فرار اور پراپیگنڈا کے ہتھیار ہیں۔ اصل چیز نصوص ہیں۔ اگر ان سے زیر بحث معنی نہیں نکلتے تو انھیں رد کرنے کے لیے اس طرح کی کم زور باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑنی چاہیے۔ یہی باتیں قدیم فقہا کے اجماع پر بھی صادق آتی ہیں۔ فقہا ایک زمانے میں علمی کام کر رہے تھے۔ ان کے زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات ان کے فیصلوں پر بھی اثر انداز ہونے کے اتنے ہی امکانات ہیں جتنے آج کے کسی اہل علم کے فکری عمل پر آج کے یہ عوامل ہو سکتے ہیں یا ہوتے ہیں۔ نیت کی پاکیزگی کا سرٹیفیکیٹ نہ ان کے نقطۂ نظر کے حق ہونے کی دلیل میں پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ پیش کیا جانا چاہیے۔ یہ فقہا جب کام کر رہے تھے تو اپنا تقویٰ دلیل کے طور پر پیش نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنا استدلال بیان کرتے تھے، جس کا جائزہ آج بھی لیا جا سکتا ہے اور اسے دلائل ہی کی بنیاد پر قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی۔ نئی آرا قائم ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔ اس کے اسباب جیسا کہ ہم نے عرض کیا، ماضی کے علمی کام میں موجود حل طلب سوالات بھی ہوتے ہیں یا نئے سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی تغیرات بھی ہوتے ہیں۔ نئی آرا غلط بھی ہوتی ہیں اور درست بھی۔ جو چیز عیب ہے، وہ قرآن و سنت کا

انکار ہے۔ان کے کسی فہم سے اختلاف قرآن وسنت کا انکار نہیں ہے۔قرآن وسنت کا فہم ہمیشہ سے مرہون دلائل ہے اور دلائل ہی کی بنا پر کسی فہم کی تردید یا تائید ہونی چاہیے۔ یہاں یہ بھی واضح کردوں کہ نصوص کے معانی طے کرنے کا عمل جن تفسیری وسائل سے ہوتا ہے، ان کے تعین اور ان کے باہمی تعلق کا مسئلہ بھی ہمیشہ سے مختلف فیہ رہا ہے۔ یہ وسائل کی بحث سراسر عقلی دلائل پر موقوف ہے۔ چنانچہ نص سے ماخوذ کسی نقطۂ نظر پر تنقید یا تو لفظ و معنی کے تعلق کی نسبت سے ہو گی یا وسائل کی نسبت سے۔ان دونوں، یعنی لغت و نحو کے مباحث اور وسائل تفسیر کے مباحث میں خلط مبحث، خطرہ ہے کہ تنقید کو لغو کر دے گا۔

کچھ دینی آرا نصوص کے بجاے عقلی مقدمات پر موقوف ہوتی ہیں۔ یہ عقلی مقدمات اتنے ناقابل تردید ہوتے ہیں کہ الفاظ کی توجیہ پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہاں اختلاف کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ یہ اچھی طرح متعین کرے کہ وہ عقلی مقدمہ کیا ہے اور اس کی بنا کس چیز پر ہے۔ عقلی مقدمات یا تو فطرت میں رکھے گئے شعور کی عطا ہیں یا تجربے اور مشاہدے کے مسلمات سے پیدا ہوتے ہیں یا ان مقدمات کے منطقی نتائج سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب کسی عقلی مقدمے کی غلطی واضح ہو جاتی ہے تو پھر اس پر قائم راے کی غلطی بھی صحیح طور پر متعین ہو جاتی ہے۔ہمارے ہاں تنقید کرنے والے بالعموم غلطی کو صحیح طور پر متعین نہیں کر پاتے۔عام طور وہ اس مشکل میں پھنسے ہوتے ہیں کہ ہمارے مانے ہوئے نتائج فکر سے انحراف کیوں ہوا ہے۔اس طرح کے کسی شخص کی تنقیدی تحریر پڑھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے بزرگوں کے استدلال کی بھی خبر نہیں ہے، یہ اس نئے نقطۂ نظر کے استدلال کا تجزیہ کیونکر کر سکتا ہے۔

اسی طرح کچھ دینی آرا قیاس واستنباط کے قواعد سے پیدا ہوتی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اصل مقدمات تو نصوص اور مسلمات علم و عقل سے ہی لیے جاتے ہیں، لیکن اطلاق و تفصیل کے دائرے کی بعض آرا ان قواعد پر منحصر ہوتی ہیں جو اہل علم نے طے کر رکھے ہیں۔ یہ سرتاسر عقلی عمل ہے۔ان کی بنا تجربے، مشاہدے، رواج اور اسی طرح منطقی نتائج پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات اس دائرے کی آرا فتویٰ پر مبنی فتوی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس دائرے کی آرا سے اختلاف کیا جائے گا تو یہ دیکھنا ہو گا کہ کسی راے کی بنا کیا ہے۔ اگر غلطی بنا میں ہے تو وہ زیر بحث آنی چاہیے اور استنباط واستدلال میں ہے تو اسے موضوع بننا چاہیے۔

دین کے حوالے سے ایک بڑا موضوع دین کو ایک کل کے طور پر دیکھنے کا ہے۔ یہ شریعت کے پہلو سے بھی دیکھا گیا ہے، جیسا کہ مقاصد شریعت کا مبحث ہماری علمی روایت کا حصہ ہے۔ یہ تعلق باللہ کی نسبت سے بھی

دیکھا گیا ہے، جیسا کہ احسان اور تزکیۂ نفس کے عنوان سے لکھی گئی کتابیں اس کی شاہد ہیں۔ مسلمانوں کے عالمی مشن کے حوالے سے بھی دیکھا گیا ہے، جیسا کہ خلافت کے حوالے سے لکھے گئے دفاتر ہر کتب خانے کا حصہ ہیں۔ ان آرا کے حق میں قرآن و حدیث کے نصوص بھی پیش کیے جاتے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے معالم بھی۔ ان آرا کے بننے میں مسلمانوں کے مجموعی حالات کا کردار بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال غلط و صحیح کا تعین کرنے کی بنیادیں یہاں بھی وہی ہیں یا نصوص کا تعین درست نہیں یا ان سے اخذ مطلب غلط ہوا ہے یا اس سارے فکری عمل کا سبب باہر ہے اور اصلاً رائے پہلے قائم کر لی گئی ہے اور اسے دین سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ کسی بھی علمی مبحث کی غلطی تبھی غلطی قرار پائے گی جب استدلال کی غلطی مشخص ہو گی۔

دور حاضر میں ہمارے فکری جدال کا ایک باعث مغرب کی فکری یلغار ہے۔ مغرب ہمارے فکری، عملی اور نفسیاتی تمام حوالوں سے تغیر و تبدل کا باعث ہے۔ اس نے ہمارے سیاسی، سماجی، معاشی، خاندانی، تعلیمی یہاں تک کہ تمام مذہبی ڈھانچوں کو جبراً تبدیل کر دیا ہے۔ ہم پچھلے دو سو سال سے ان تمام تبدیلیوں کے رد و قبول کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ کہیں ہم ان کے مقابلے میں اسلام کی نئی تفہیم پیش کرتے ہیں، کہیں ہم ان تبدیلیوں ہی کو اسلامیانے کے عمل میں مصروف نظر آتے ہیں اور کہیں ہم گوشہ گیر ہو کر نام نہاد روایت کو سینے سے لگا کر مطمئن ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ تغیر بہر صورت ہمیں تبدیل کرنے کے درپے ہے۔

اس حوالے سے بھی نقد و نظر کا معرکہ برپا ہے۔ یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ دین کو اس کی اصل صورت میں سمجھا جائے اور اس کی روشنی میں تمام انحرافات کو متعین کر کے ان کی تردید کا استدلال مرتب کیا جائے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ صٓ

(۴)

وَاذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الشَّيۡطٰنُ بِنُصۡبٍ

اور ہمارے بندے ایوب [۱۵۹] کو یاد کرو، جب اُس نے اپنے رب سے فریاد کی [۱۶۰] کہ شیطان نے

۱۵۹۔ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی طرح یہ بھی اسرائیلی پیغمبر تھے جو غالباً نویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت ہوئے۔

۱۶۰۔ اِس فریاد کا ایک پس منظر ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"... سفر ایوب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب کو بڑی دولت و حشمت حاصل تھی، لیکن اِس کے باوجود وہ نہایت خدا ترس اور عبادت گزار بندے تھے۔ اُن کی اِس حالت پر شیطان اور اُس کے ایجنٹوں کو بڑا حسد ہوا اور اُنھوں نے اُن کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ اگر ایوب دن رات خدا کی عبادت ہی میں لگے رہتے ہیں تو یہ کیا کمال ہوا، خدا نے جب اتنا مال و اسباب دے رکھا ہے تو عبادت نہ کریں تو اور کیا کریں، ہم تو جب جانیں، جب خدا یہ ساری چیزیں اُن سے چھین لے اور پھر بھی وہ اُس کے عبادت گزار رہیں! بالآخر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے اُن کو محروم کر دیا۔ نہ اُن کے پاس مال کے قسم کی کوئی چیز باقی رہ گئی اور نہ اولاد و احفاد اور خدم و حشم باقی رہ گئے۔ لیکن وہ اِس عظیم مصیبت سے مایوس نہیں ہوئے، بلکہ اپنے رب کے حضور سجدے میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں اپنی ماں کے پیٹ سے ننگا پیدا ہوا تھا اور اب ننگا ہی اپنے رب کے پاس جاؤں گا۔

وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾ اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ
اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ

مجھے سخت دکھ اور آزار میں مبتلا کر رکھا ہے۔[۱۶۱] ہم نے ہدایت کی کہ اپنا پاؤں زمین پر مارو۔[۱۶۲] (اُس نے مارا تو ایک چشمہ نکل آیا۔[۱۶۳] فرمایا): یہ تمھارے نہانے اور پینے کے لیے ٹھنڈا پانی ہے۔ (اِس سے شفا ہو جائے گی۔ پھر) اُس کے اہل و عیال بھی ہم نے اُسے دوبارہ عطا فرمائے اور اُن کے ساتھ اتنے ہی اور بھی،[۱۶۴] اِس لیے کہ اُس پر اپنی طرف سے رحمت فرمائیں اور اِس لیے کہ عقل والوں کو

سفر ایوب میں ہے کہ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ نے شیطان سے کہا کہ تو نے میرے بندے کو دیکھ لیا کہ سب کچھ چھن جانے کے بعد بھی وہ میرا ہی ہے۔ اِس پر شیطان نے کہا کہ یہ مال و اولاد کا معاملہ تھا، اِس وجہ سے وہ صبر کر گیا، میں تو جب جانوں، جب تو اُس کو شدید قسم کے جسمانی آزاروں میں مبتلا کرے اور پھر بھی وہ تیرا عبادت گزار رہ جائے! چنانچہ اِس کے بعد وہ ایسے شدید قسم کے جسمانی آزار میں مبتلا ہوئے کہ سفر ایوب میں اِس کی تفصیل پڑھیے تو دل کانپ جاتا ہے۔ لیکن اِس کے بعد اُن کی انابت اللہ کی طرف اور بڑھ گئی اور اِس آزمایش میں بھی اُنھوں نے شیطان کو شکست دے دی۔" (تدبر قرآن ۶/ ۵۳۹)

۱۶۱۔ اپنے دکھ اور آزار کو ایوب علیہ السلام نے شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ سبب کے پہلو سے ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... بندے کو جو آزمایشیں پیش آتی ہیں، وہ پیش تو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آتی ہیں، لیکن اُن کے پیش آنے میں ایک اہم عامل شیطان بھی ہوا کرتا ہے۔ اِس وجہ سے مشیت و قدرت کے پہلو سے وہ خدا کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور سبب کے پہلو سے شیطان کی طرف۔ اِسی پہلو سے حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے دکھ اور آزار کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔" (تدبر قرآن ۶/ ۵۳۹)

۱۶۲۔ یعنی جب اُنھوں نے شیطان کو شکست دے دی تو ہم نے یہ ہدایت فرمائی۔

۱۶۳۔ یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ دریاؤں کے کنارے زمین کی بالائی سطح کو ہاتھ یا پاؤں سے کرید ا جائے تو اِس طرح کی سوتیں اکثر پھوٹ پڑتی ہیں۔

۱۶۴۔ سفر ایوب میں اِس کی تفصیل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

ضِغۡثًا فَاضۡرِبۡ بِّهٖ وَلَا تَحۡنَثۡ ؕ اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ﴿۴۴﴾

یاددہانی ہو۔[۱۶۵] اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں سینکوں کا ایک مٹھا لو اور اُس سے اپنے آپ کو مارو اور (اپنے کو سزا دینے کی جو قسم تم نے کھالی تھی، [۱۶۶] اُس میں) حانث [۱۶۷] نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اُسے (ہر حال میں) صابر پایا۔ کیا ہی خوب بندہ تھا! کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف

"... خداوند نے ایوب کو، جتنا اُس کے پاس پہلے تھا، اُس کا دوچند دیا۔ تب اُس کے سب بھائی اور سب بہنیں اور اُس کے سب اگلے جان پہچان اُس کے پاس آئے اور اُس کے گھر میں اُس کے ساتھ کھانا کھایا... یوں خداوند نے ایوب کے آخری ایام میں ابتدا کی نسبت زیادہ برکت بخشی اور اُس کے پاس چودہ ہزار بھیڑ بکریاں اور چھ ہزار اونٹ اور ہزار جوڑی بیل اور ہزار گدھیاں ہو گئیں۔ اُس کے سات بیٹے اور تین بیٹیاں بھی ہوئیں... اور اِس کے بعد ایوب ایک سو چالیس برس جیتا رہا اور اپنے بیٹے اور پوتے چوتھی پشت تک دیکھے۔" (۴۲: ۱۰-۱۶)

۱۶۵۔ یعنی اِس بات کی یاددہانی کہ اللہ تعالیٰ بعض اوقات اپنے بندوں کی وفاداری کو ثابت کرنے کے لیے اُنھیں سخت ترین آزمایشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تاہم یہ آزمایشیں ایک حد سے متجاوز نہیں ہوتیں اور جو چیز اِن سے نجات کا باعث بنتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت ہی ہے۔

۱۶۶۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ابتلا کے زمانے میں کوئی ایسی بات اُن کے منہ سے نکل گئی جو صبر اور انابت الی اللہ کے منافی تھی۔ اِس پر اُنھوں نے قسم کھالی کہ وہ اپنے آپ کو سزا دیں گے اور اِس کے لیے اتنے کوڑے ماریں گے۔

۱۶۷۔ قسم اگر اللہ کی یا اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کا باعث بن رہی ہو تو اُسے توڑ دینا ضروری ہے۔ لیکن یہ چونکہ عہد و پیمان پر خدا کی گواہی ہوتی ہے اور عہد و پیمان کا معاملہ دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اِس وجہ سے اُن کو یہ ہدایت ہوئی کہ وہ اِس طریقے سے رسمی طور پر اُس کو پورا کر لیں۔ اِس سے اُنھیں کوئی ناروا تکلیف بھی نہیں پہنچے گی اور قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ دین میں قسم کا کفارہ اِسی طرح کی صورت حال کے لیے مقرر کیا گیا ہے، مگر ایوب علیہ السلام اُس وقت نہ کوئی مالی کفارہ ادا کرنے کے قابل تھے، نہ جسمانی۔ چنانچہ یہی ایک صورت رہ جاتی تھی جس سے وہ اپنے دل کی تسکین کر سکتے تھے۔ یہ ایک بندۂ مومن کو بے جا اذیت سے بچانے کے لیے خدا کی عنایت تھی۔ اِس سے حرام کو حلال کرنے یا فرائض کو ساقط کرنے یا نیکی کے کسی کام سے بچنے کے لیے حیلے تراشنے کا جواز پیدا کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾
اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ
الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾
وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ط وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۸﴾
هٰذَا ذِكْرٌ ط وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۹﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ

بڑا ہی رجوع کرنے والا تھا۔[۱۶۸] ۴۱-۴۴

اور ہمارے بندوں، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو، قوت[۱۶۹] اور بصیرت والے۔ ہم نے اُن کو ایک خاص کام —— اُس گھر[۱۷۰] کی یاد دہانی —— کے لیے منتخب کیا تھا اور یقیناً وہ ہمارے ہاں برگزیدہ اور نیک بندوں میں سے تھے۔ ۴۵-۴۷

اور اسمٰعیل اور یسع[۱۷۱] اور ذوالکفل[۱۷۲] کو یاد کرو۔ یہ سب بھی اخیار میں سے تھے۔ ۴۸

یہ یاد دہانی ہے۔ (اِس سے یاد دہانی حاصل کرو) اور (یاد رکھو کہ) اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے

۱۶۸۔ یہی صفت سلیمان علیہ السلام کے تذکرے میں بھی نمایاں کی گئی ہے۔ اِس سے اُس مقصد کی طرف توجہ ہوتی ہے جو اِن سرگذشتوں کے سنانے سے پیش نظر ہے۔

۱۶۹۔ یہ اُس پدرسرانہ قسم کی سرداری کی طرف اشارہ ہے جو اِن جلیل القدر پیغمبروں کو اپنے لوگوں میں حاصل تھی۔

۱۷۰۔ یعنی آخرت کے گھر کی۔ انبیا علیہم السلام اصلاً اُسی کی منادی کے لیے مبعوث ہوئے۔

۱۷۱۔ اِس سے ملتے جلتے نام کے جن دو پیغمبروں کا ذکر بائیبل میں ہوا ہے، اُن میں سے 'الیشع' قرآن کے تلفظ سے قریب تر ہے۔ اِن کا زمانہ ۱۳۷ق م بتایا جاتا ہے۔ یہ دریاے اردن کے کنارے ایک مقام ابیل محولہ کے رہنے والے تھے۔ دوسرے یسعیاہ ہیں جن کا زمانہ ۶۲۰ق م بتایا گیا ہے۔

۱۷۲۔ اِن کی سرگذشت حیات پردۂ خفا میں ہے۔ تاہم اتنی بات واضح ہے کہ یہ بھی اُن پیغمبروں میں سے ہیں جن کا امتیازی وصف صبر ہے۔

الْاَبْوَابُ ﴿۵۰﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ ﴿۵۱﴾
وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿۵۲﴾ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۵۳﴾
اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾

هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿۵۵﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۵۶﴾
هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿۵۷﴾ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ؕ ﴿۵۸﴾
هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا ۢ بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿۵۹﴾ قَالُوْا
بَلْ اَنْتُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا ۢ بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾ قَالُوْا

یقیناً بہترین ٹھکانا ہے، ہمیشہ کے باغ جن کے دروازے اُن کے لیے کھلے ہوئے ہوں گے۔[۱۷۳] وہ اُن میں تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اُن میں بہت سے میوے اور مشروبات (اپنے خدام سے) طلب کر رہے ہوں گے۔ اُن کے پاس شرمیلی ہم سن، عورتیں ہوں گی — یہ وہ چیز ہے جس کا حساب کے دن کے لیے تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ بے شک، یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔۴۹-۵۴

ایک طرف یہ اور دوسری طرف سرکشوں کے لیے یقیناً بدترین ٹھکانا ہے، جہنم جس میں وہ جا پڑیں گے۔ سو کیا ہی برا مقام ہے! یہ کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اِس کو چکھیں اور اِسی قسم کی دوسری چیزیں بھی (اُن کے لیے موجود) ہوں گی۔۵۵-۵۸

(اُنھیں بتایا جائے گا: یہ تمھارے پیرووں کی بھیڑ چلی آ رہی ہے)۔ یہ بھیڑ بھی تمھارے ساتھ ہی داخل ہونے والی ہے۔ فوراً کہیں گے: اِن پر خدا کی مار! یہ تو آگ میں پڑنے والے ہیں۔ پیرو جواب دیں گے: بلکہ تم، تم پر خدا کی مار! یہ (جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں) تمھی ہمارے آگے لائے

۱۷۳۔ یعنی پہلے سے کھول دیے جائیں گے، جیسے معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے کھول دیے جاتے ہیں۔

رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾
وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿٦٢﴾ ط اَتَّخَذْنٰهُمْ
سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾
قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ق صلے وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ ج رَبُّ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لا اَنْتُمْ عَنْهُ
مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾

ہو۔[۱۷۴] سو کیا ہی برا ٹھکانا ہو گا! (اُس وقت) کہیں گے: اے ہمارے رب، یہ جو اِس کو ہمارے آگے لائے ہیں، اِن کو تو اِس (بھڑکتی) آگ میں دونا عذاب دے۔ ۵۹-۶۱

(اِس کے بعد ایک دوسرے سے) پوچھیں گے: کیا بات ہے، ہم اُن لوگوں کو یہاں نہیں دیکھ رہے ہیں جن کو ہم بروں میں گنا کرتے تھے؟[۱۷۵] کیا (اِس لیے کہ) ہم نے یونہی (محض شرارت سے) اُن کو مذاق بنالیا تھا یا (وہ بھی یہاں موجود ہیں اور) اُن سے ہماری نگاہیں چوک رہی ہیں؟ کچھ شک نہیں، اہل دوزخ کی یہ تو تکار ایک واقعی بات ہے جو ہو کر رہنی ہے۔ ۶۲-۶۴

اِن سے کہو، (اے پیغمبر) کہ میں تو صرف ایک خبردار کرنے والا ہوں۔ (اپنے معبودوں کے بل پر تم میرے انذار سے بے پروا ہو رہے ہو تو سن لو کہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، یکتا اور سب پر غالب۔ وہی زمین اور آسمانوں اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے، سب کا پروردگار ہے، زبردست اور بخشنے والا۔ کہو کہ جس سے میں خبردار کر رہا ہوں، وہ ایک بڑی خبر[۱۷۶] ہے اور تم اُس سے اعراض

۱۷۴۔ اِس فقرے میں مبتدا کا اعادہ بھی ہے اور دو مبتداؤں کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ بھی۔ ایک ایک لفظ سے غصہ گویا ابل رہا ہے۔

۱۷۵۔ یعنی اُن لوگوں میں گنا کرتے تھے جو دین آبائی کے دشمن ہیں، ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہیں اور قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۷۶۔ یعنی عذاب اور قیامت کی خبر۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ اِلَّآ
اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾
اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ﴿٧١﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ
وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ
اَجْمَعُوْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ
مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ
الْعَالِيْنَ ﴿٧٥﴾ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿٧٦﴾

کیے ہوئے ہو۔۶۵-۶۸

مجھے عالم بالا کی کچھ خبر نہ تھی، جب دوزخ کے لوگ وہاں جھگڑ رہے ہوں گے۔[177] (یہ وحی کی باتیں ہیں اور) مجھے یہ وحی صرف اِس لیے کی جاتی ہے کہ میں (خدا کی طرف سے) ایک کھلا خبردار کرنے والا ہوں۔۶۹-۷۰

(اِن کے انکار کی وجہ بھی وہی ہے، اے پیغمبر، جو ابلیس کی تھی)۔ اِنھیں وہ قصہ سناؤ، جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اُس کو درست کرلوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ چنانچہ فرشتے، سب کے سب اکٹھے سجدے میں گر گئے، مگر ابلیس نہیں گرا۔ اُس نے گھمنڈ کیا اور منکروں میں سے ہو گیا۔ پروردگار نے فرمایا: اے ابلیس، تجھے کیا چیز اُس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے؟[178] یہ تو نے تکبر کیا یا (اپنے زعم میں) تو کوئی برتر ہستی ہے؟ اُس نے جواب دیا: میں اِس سے کہیں بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اِس کو مٹی

۱۷۷۔ یہ اُسی تو تکار کا حوالہ ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

۱۷۸۔ یعنی اہتمام کے ساتھ اپنے دست قدرت سے تخلیق کیا ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے انسان فی الواقع خدا کا ایک شاہ کار ہے اور بڑے غیر معمولی اوصاف اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے۔

قَالَ فَاخۡرُجۡ مِنۡهَا فَاِنَّكَ رَجِيۡمٌ ۝٧٧ وَّاِنَّ عَلَيۡكَ لَعۡنَتِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝٧٨
قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ ۝٧٩ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الۡمُنۡظَرِيۡنَ ۝٨٠ اِلٰى
يَوۡمِ الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ ۝٨١ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝٨٢ اِلَّا عِبَادَكَ
مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ۝٨٣ قَالَ فَالۡحَقُّ وَالۡحَقَّ اَقُوۡلُ ۝٨٤ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكَ
وَمِمَّنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝٨٥

سے پیدا کیا ہے۔[179] فرمایا: اچھا تو یہاں سے[180] نکل جا، اِس لیے کہ تو راندۂ درگاہ ہے اور تجھ پر اب جزا کے دن تک میری لعنت ہے۔ اُس نے کہا: پروردگار، پھر مجھے اُس دن تک مہلت دے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: جا، تجھے اُس دن تک کی مہلت ہے جس کا وقت معین ہے۔ اُس نے کہا: پھر مجھے بھی تیری عزت کی قسم، میں اِن سب کو گم راہ کر کے رہوں گا،[181] تیرے اُن بندوں کے سوا جنھیں تو نے اُن میں سے خاص کر لیا ہو۔ فرمایا: تو حق یہ ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں تجھ سے اور اُن سب لوگوں سے جہنم کو بھر دوں گا جو اُن میں سے تیری پیروی کریں گے۔[182] ۷۷-۸۵

۱۷۹۔ قریش کے لیڈر بھی اِسی طرح کے زعم میں مبتلا تھے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ یہ قرآن مکہ اور طائف کے کسی بڑے رئیس پر کیوں نہیں اتارا گیا؟ یہ اِسی بے مایہ شخص پر کیوں اترا ہے؟

۱۸۰۔ آیت میں 'مِنْهَا' کا لفظ ہے۔ اِس میں ضمیر کا مرجع وہی جنت ہے جس میں آدم کو رکھا گیا اور اُن کے آگے جنات اور فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا گیا تھا۔

۱۸۱۔ یعنی تیری اُس اسکیم کو، جہاں تک ممکن ہوا، ناکام بنانے کی کوشش کروں گا جس کے تحت تو نے اپنی جنت کے لیے اولادِ آدم کو منتخب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۱۸۲۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ مخاطبین کے لیے تنبیہ ہے کہ اِس آئینے میں وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ﴿٨٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا
ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿٨٨﴾

اِن سے کہہ دو، (اے پیغمبر) کہ میں (یہ قرآن سنا رہا ہوں تو) اِس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور نہ میں اپنے کو بنا کر پیش کرنے والوں میں سے ہوں۔ یہ تو صرف ایک یاددہانی ہے، دنیا والوں کے لیے، اور یقین رکھو کہ جو خبر یہ دے رہا ہے، اُس کی حقیقت تم کو تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہو جائے گی۔ ۸۶-۸۸

کوالالمپور

۲۵/ مئی ۲۰۱۴ء

جاوید احمد غامدی
محمد رفیع مفتی / محسن ممتاز

یہود کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں خبر دینا

— ۱ —

عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ عَنْ شَيْخٍ، مِنْ بَنِي قُرَيْظَةَ قَالَ:[۱] هَلْ تَدْرِي مَا كَانَ عَلَامَةُ إِسْلَامِ ثَعْلَبَةَ بْنِ سُعْنَةَ وَأُسَيْدِ بْنِ سُعْنَةَ وَأَسَدِ بْنِ عُبَيْدٍ؟ نَفَرٌ مِنْ بَنِي ذُهْلٍ،[۲] لَيْسُوا مِنْ بَنِي قُرَيْظَةَ، وَلَا بَنِي نَضِيرٍ، [كانوا فوق ذلك].[۳] ...أَتَوْا بَنِي قُرَيْظَةَ كَانُوا مَعَهُمْ فِي جَاهِلِيَّتِهِمْ، ثُمَّ كَانُوا سَادَتَهُمْ فِي الْإِسْلَامِ، قَالَ: قُلْتُ: لَا، قَالَ: فَإِنَّ رَجُلًا مِنْ يَهُودِ أَهْلِ الشَّامِ يُقَالُ لَهُ: ابْنُ الْهَيَّبَانِ، قَدِمَ عَلَيْنَا قَبْلَ الْإِسْلَامِ بِسَنَوَاتٍ، فَحَلَّ بَيْنَ أَظْهُرِنَا، وَاللّٰهِ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا قَطُّ يُصَلِّي الْخَمْسَ أَفْضَلَ مِنْهُ، فَأَقَامَ عِنْدَنَا، فَكُنَّا إِذَا قَحَطَ الْمَطَرُ قُلْنَا لَهُ: يَا ابْنَ الْهَيَّبَانِ، قُمْ، فَاسْتَسْقِ لَنَا، فَيَقُولُ: لَا، وَاللّٰهِ حَتَّى تُقَدِّمُوا

بَيْنَ يَدَيْ مُخْرِجِكُمْ صَدَقَةً، فَيَقُولُونَ: كَمْ؟ فَيَقُولُ: صَاعًا تَمْرًا أَوْ مُدًّا[۴] مِنْ شَعِيرٍ عَنْ كُلِّ إِنْسَانٍ، قَالَ: فَنُخْرِجُهَا، فَيَخْرُجُ بِنَا إِلَى ظَاهِرِ حَرَّتِنَا، فَيَسْتَسْقِي لَنَا، فَوَاللّٰهِ مَا يَبْرَحُ مِنْ مَجْلِسِهِ، حَتَّى يَمُرَّ السَّحَابُ السَّرَاحُ سَائِلَةً، وَنُسْقَى بِهِ،[۵] فَفَعَلَ ذَلِكَ غَيْرَ مَرَّةٍ وَلَا مَرَّتَيْنِ وَلَا ثَلَاثًا، ثُمَّ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ، فَلَمَّا عَرَفَ أَنَّهُ مَيِّتٌ قَالَ: يَامَعْشَرَ يَهُودَ، مَا تَرَوْنَهُ أَخْرَجَنِي مِنْ أَرْضِ الْخَمْرِ وَالْخَمِيرِ إِلَى أَرْضِ الْجُوعِ وَالْبُؤْسِ؟ قَالَ: قُلْنَا: اَللّٰهُ أَعْلَمُ، قَالَ: فَإِنِّي قَدِمْتُ إِلَى هَذَا الْبَلَدِ لِتَوَكُّفِ خُرُوجِ نَبِيٍّ قَدْ أَظَلَّ زَمَانُهُ، هَذِهِ الْبَلْدَةُ مُهَاجَرُهُ، فَكُنْتُ أَرْجُو أَنْ يُبْعَثَ فَأَتَّبِعَهُ، وَقَدْ أَظَلَّكُمْ زَمَانُهُ، فَلَا يَسْبِقَنَّكُمْ إِلَيْهِ يَا مَعَاشِرَ الْيَهُودِ، أَحَدٌ، فَإِنَّهُ يُبْعَثُ بِسَفْكِ الدِّمَاءِ، وَسَبْيِ الذَّرَارِي وَالنِّسَاءِ مِمَّنْ خَالَفَهُ، فَلَا يَمْنَعْكُمْ ذَلِكَ مِنْهُ، فَلَمَّا بُعِثَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَحَاصَرَ بَنِي قُرَيْظَةَ قَالَ هَؤُلَاءِ الْفِتْيَةُ، وَكَانُوا شَبَابًا أَحْدَاثًا: يَا بَنِي قُرَيْظَةَ، وَاللّٰهِ، إِنَّهُ لَلنَّبِيُّ الَّذِي عَهِدَ إِلَيْكُمُ ابْنُ الْهَيَّبَانِ، فَقَالُوا: لَيْسَ بِهِ، قَالُوا: بَلَى، وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَهُوَ بِصِفَتِهِ، وَنَزَلُوا وَأَسْلَمُوا، فَأَحْرَزُوا دِمَاءَهُمْ، وَأَمْوَالَهُمْ، وَأَهْلِيهِمْ.

عاصم بن عمر سے روایت ہے، وہ بنو قریظہ کے ایک سن رسیدہ آدمی سے بیان کرتے ہیں کہ اُس نے مجھ سے پوچھا: کیا تم ثعلبہ بن سعنہ، اُسید بن سعنہ اور اسد بن عبید کے اسلام لانے کی وجہ

جانتے ہو؟ یہ نہ بنو قریظہ میں سے تھے اور نہ بنو نضیر میں سے، بلکہ اوپر سے متعلق تھے اور اِن کا نسب بنی ذہل سے تھا۔ یہ دور جاہلیت میں بنو قریظہ کے پاس آئے اور اُنھی کے ساتھ رہنے لگے تھے، پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو یہی اُن کے پیش رو ٹھیرے۔

راوی (عاصم) کہتے ہیں: میں نے جواب دیا کہ نہیں، میں اِن باتوں سے واقف نہیں ہوں۔ اِس پر اُس بوڑھے شخص نے بتایا کہ شام کے علاقے کا ایک یہودی، جو ابن الہیَّبان کہلاتا تھا، زمانۂ اسلام سے کچھ سال پہلے ہمارے پاس (یثرب میں) آ کے ٹھیرا تھا۔ بخدا، پانچ نمازیں اُس سے بہتر پڑھنے والا کوئی آدمی ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا[1]۔ وہ ہمارے ساتھ ہی رہا۔

(ہمارے ہاں) جب کبھی بارش رک جایا کرتی تو ہم اُس سے کہتے: اے ابن الہیبان، آپ اُٹھیں اور ہمارے لیے بارش کی دعا کریں۔ وہ کہتا: نہیں، بخدا، بارش کی دعا کے لیے نکلنے سے پہلے کچھ صدقہ لازماً کرو۔ لوگ پوچھتے کہ کتنا صدقہ کریں تو وہ کہتا: ہر آدمی کی طرف سے ایک صاع کھجور یا ایک مد جو۔ اس بوڑھے آدمی نے بتایا: چنانچہ ہم وہ صدقہ کیا کرتے تھے۔ پھر وہ ہمیں میدان میں لے جاتا اور ہمارے لیے بارش کی دعا کرتا[2]۔ خدا کی قسم، وہ اپنی اُس مجلس سے اٹھا بھی نہ ہوتا کہ جل تھل کرتے بادل امڈ آتے اور ہمیں سیراب کر جاتے۔ اُس نے ایک دو بار نہیں، کئی بار ایسا ہی کیا، حتیٰ کہ اُس کی موت کا وقت آ گیا۔

چنانچہ اُسے جب محسوس ہوا کہ وہ قریب المرگ ہے تو اُس نے کہا: یہود کے لوگو، تمھارا کیا خیال ہے کہ مجھے رزق فراواں کی سر زمین سے اِس افلاس زدہ علاقے کی طرف کیا چیز لائی تھی؟ راوی کہتے ہیں: ہم نے کہا کہ خدا ہی جانتا ہے۔ اُس نے کہا کہ اِس علاقے میں عنقریب ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ یہ شہر اُس کی ہجرت گاہ ہو گا۔ میں امید کرتا تھا کہ وہ (میری زندگی ہی میں) مبعوث ہوا تو میں اُس کی اتباع کروں گا[3]۔

اُس کا زمانہ اب تم سے قریب ہی ہے۔ سو یہود کے لوگو، اُس پر ایمان لانے میں تم پر ہرگز کوئی سبقت نہ کرنے پائے۔ بے شک، وہ اپنے مخالفین کا خون بہانے اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو

قیدی بنانے کا حکم لے کر آئے گا[4]۔ چنانچہ (دھیان رکھنا) کہیں یہ بات تمھیں اُس پر ایمان لانے سے روک نہ دے۔[5]

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، اور (ایک موقع پر) آپ نے بنو قریظہ کا محاصرہ کیا تو اِن نوجوانوں نے کہا —— یہ اُس وقت نو عمر لڑکے تھے —— اے بنو قریظہ، بخدا، یہ وہی نبی ہے جس (پر ایمان لانے) کا اقرار تم سے ابن الہیبان نے لیا تھا۔ اُنھوں نے کہا: نہیں، یہ وہ نہیں ہے، اس پر وہ (نوجوان چیخ کر) بولے: کیوں نہیں، بخدا، یہ اپنی صفات کے لحاظ سے بالکل وہی ہیں۔ (جب وہ نہیں مانے تو) یہ نوجوان (قلعے سے) نیچے اترے اور اسلام لے آئے، لہٰذا اِنھوں نے اپنے جان و مال اور اپنے اہل خانہ کو بچا لیا۔

۱۔ اِس سے واضح ہے کہ زمانۂ رسالت کے یہودی شب و روز کی پانچ نمازوں سے واقف تھے اور اُن میں سے بعض یہ نمازیں اُسی طرح پڑھتے بھی تھے، جس طرح مسلمان اب صدیوں سے پڑھ رہے ہیں۔

۲۔ یہ بعینہٖ وہی نماز ہے، جسے ہمارے ہاں ''نماز استسقا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۳۔ قرآن نے اِسی بنا پر فرمایا ہے کہ قرآن اور قرآن کے لانے والے کو اہل کتاب اُسی طرح پہچانتے تھے، جس طرح کوئی مہجور باپ اپنے بیٹے کو پہچانتا ہے۔

۴۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین پر اُس عذاب کی نوعیت کیا ہو گی، جو اہل کتاب میں سے آپ کے مخالفین پر آپ کی طرف سے اتمام حجت کے بعد آئے گا؟ یہ اُس کا بیان ہے۔

۵۔ اِس لیے کہ یہی وہ چیز تھی، جو لوگوں کے لیے مزلۂ قدم ہوتی اور وہ جزا و سزا کے اِس خدائی فیصلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا عمل خیال کر کے اِس کے بارے میں بدگمان ہو سکتے تھے۔

متن کے حواشی

۱۔ اس روایت کا متن دلائل النبوۃ، ابو نعیم اصبہانی، رقم ۴۲ سے لیا گیا ہے۔ اس کے تنہا راوی عاصم بن عمر بن قتادہ ہیں۔ اس کا ایک ہی متابع ہے، جو سیرۃ ابن اسحاق ۲/۶۵ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہاں 'بَنِي ذُهْلٍ' کے الفاظ راوی کی غلطی ہے، اصل الفاظ 'بَنِي هَدلٍ' ہیں جیسا کہ اسد الغابہ،

ابن اثیر ۱/ ۲۸۸ میں اِن تینوں افراد کے قبیلے کے بارے میں واضح ہے۔

۳۔ ثعلبہ بن سعنہ، اسید بن سعنہ اور اسد بن عبید، یہ تینوں افراد بنو ہدل کی ایک جماعت تھے، جو بنو قریظہ اور بنو نضیر کے چچیرے بھائی تھے۔ ملاحظہ ہو: سیرۃ ابن ہشام ۲/ ۲۳۸۔

۴۔ سیرت ابن اسحاق ۲/ ۶۵ میں اس جگہ 'مدًا'، کے بجاے 'مدین' ''دومد'' کے الفاظ منقول ہیں۔

۵۔ سیرت ابن اسحاق ۲/ ۶۵ ہی میں اس جگہ 'حَتَّى يَمُرَّ السَّحَابُ السَّرَاحُ سَائِلَةً، وَنُسْقَى بِهِ' کے بجاے 'حَتَّى تَمُرَّ الشِّعَابُ' ''یہاں تک کہ وادیاں بہ نکلتیں'' کے الفاظ آئے ہیں۔

—۲—

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ سَلَامَةَ بْنِ وَقْشٍ وَكَانَ مِنْ أَصْحَابِ بَدْرٍ، قَالَ:[1] كَانَ لَنَا جَارٌ مِنْ يَهُودَ فِي بَنِي عَبْدِ الْأَشْهَلِ قَالَ: فَخَرَجَ عَلَيْنَا يَوْمًا مِنْ بَيْتِهِ قَبْلَ مَبْعَثِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَسِيرٍ، فَوَقَفَ عَلَى مَجْلِسِ بَنِي عَبْدِ الْأَشْهَلِ، قَالَ سَلَمَةُ: وَأَنَا يَوْمَئِذٍ أَحْدَثُ مَنْ فِيهِ سِنًّا، عَلَيَّ بُرْدَةٌ مُضْطَجِعًا فِيهَا بِفِنَاءِ أَهْلِي، فَذَكَرَ الْبَعْثَ، وَالْقِيَامَةَ، وَالْحِسَابَ، وَالْمِيزَانَ، وَالْجَنَّةَ، وَالنَّارَ، فَقَالَ: ذَلِكَ لِقَوْمٍ أَهْلِ شِرْكٍ أَصْحَابِ أَوْثَانٍ[2]، لَا يَرَوْنَ أَنَّ بَعْثًا كَائِنٌ بَعْدَ الْمَوْتِ، فَقَالُوا لَهُ: وَيْحَكَ يَا فُلَانُ[3]، تَرَى هَذَا كَائِنًا؟ إِنَّ النَّاسَ يُبْعَثُونَ بَعْدَ مَوْتِهِمْ إِلَى دَارٍ فِيهَا جَنَّةٌ وَنَارٌ، يُجْزَوْنَ فِيهَا بِأَعْمَالِهِمْ، قَالَ: نَعَمْ، وَالَّذِي يُحْلَفُ بِهِ لَوَدَّ أَنَّ لَهُ بِحَظِّهِ مِنْ تِلْكَ النَّارِ أَعْظَمَ تَنُّورٍ فِي الدُّنْيَا، يُحَمُّونَهُ ثُمَّ يُدْخِلُونَهُ إِيَّاهُ فَيُطْبَقُ بِهِ عَلَيْهِ وَأَنْ يَنْجُوَ مِنْ تِلْكَ النَّارِ غَدًا، قَالُوا لَهُ: وَيْحَكَ وَمَا آيَةُ ذَلِكَ؟ قَالَ: نَبِيٌّ يُبْعَثُ مِنْ

نَحْوِ هَذِهِ الْبِلَادِ وَأَشَارَ بِيَدِهِ نَحْوَ مَكَّةَ وَالْيَمَنِ[4]، قَالُوا: وَمَتَى تَرَاهُ؟ قَالَ: فَنَظَرَ إِلَيَّ وَأَنَا مِنْ أَحْدَثِهِمْ سِنًّا، فَقَالَ: إِنْ يَسْتَنْفِدْ هَذَا الْغُلَامُ عُمُرَهُ يُدْرِكْهُ، قَالَ سَلَمَةُ: فَوَاللّٰهِ مَا ذَهَبَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتَّى بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰى رَسُولَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ حَيٌّ بَيْنَ أَظْهُرِنَا، فَآمَنَّا بِهِ وَكَفَرَ بِهِ بَغْيًا وَحَسَدًا، فَقُلْنَا: وَيْلَكَ يَا فُلَانُ، أَلَسْتَ بِالَّذِي قُلْتَ لَنَا فِيهِ مَا قُلْتَ؟ قَالَ: بَلَى. وَلَيْسَ بِهِ.

سیدنا سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، یہ اصحاب بدر میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ بنو عبد الاشہل (کے محلے) میں ایک یہودی ہمارا پڑوسی تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ ہی عرصہ پہلے وہ ایک روز اپنے گھر سے نکلا اور (ہمارے لوگوں)، بنو عبد الاشہل کی مجلس کے پاس رک گیا —— سلمہ کہتے ہیں کہ میں اُس مجلس کے لوگوں میں سب سے کم عمر تھا اور اپنے گھر کے صحن میں چادر اوڑھ کر لیٹا ہوا تھا —— پھر اُس نے موت کے بعد زندگی، قیامت، اعمال کے حساب کتاب، میزان اور جنت و جہنم کا تذکرہ کیا۔ یہ باتیں وہ مشرک اور بت پرست لوگوں سے کہہ رہا تھا، جو موت کے بعد زندگی کے قائل نہیں تھے۔ اُنھوں نے یہ باتیں سنیں تو اُس سے کہا: اے فلاں، تیرا بھلا ہو، کیا تو سمجھتا ہے کہ یہ سب ہو گا کہ لوگ موت کے بعد ایک ایسی دنیا میں اٹھائے جائیں گے، جس میں جنت ہو گی، جہنم ہو گی اور وہاں وہ اپنے اعمال کا بدلہ پائیں گے؟ اُس نے کہا: ہاں، اُس ذات کی قسم، جس کی قسم کھائی جاتی ہے، میں تو پسند کرتا ہوں کہ (آخرت کی) اُس آگ میں سے مجھے ملنے والے حصے کے بجائے، اِس دنیا ہی میں میرے لیے ایک بڑا تنور دہکایا جائے، پھر مجھے اُس میں ڈال کر اوپر سے بند کر دیا جائے اور میں کل جہنم کی اُس آگ سے نجات پا جاؤں۔ لوگوں نے پوچھا: تیرا بھلا ہو، (یہ بتاؤ کہ) اُس کی علامت کیا ہو گی؟ اُس نے بتایا (کہ اُس کی علامت) ایک نبی ہے جو اِن علاقوں سے مبعوث ہو گا[1]، اور اپنے ہاتھ سے مکہ اور

یمن کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے پوچھا: اُس کی بعثت کب ہو گی؟ سلمہ بن سلامہ کہتے ہیں: اُس نے (مجمعے میں) مجھے دیکھا، میں اُن میں سب سے چھوٹا تھا، اور کہنے لگا: اگر اِس لڑکے نے اپنی پوری عمر گزاری تو یہ اُس کو دیکھ لے گا[2]۔ سیدنا سلمہ کہتے ہیں کہ پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر دیا، اور وہ یہودی بھی اُس وقت زندہ تھا۔ ہم تو اُن پر ایمان لے آئے، لیکن اُس نے اپنی سرکشی اور حسد کی وجہ سے آپ کا انکار کر دیا۔ اِس پر ہم نے اُس سے پوچھا: تیرا ناس ہو، کیا اِن کے حوالے سے خود تمھی نے ہم سے نہیں کہا تھا؟ اُس نے کہا: کیوں نہیں، (میں نے کہا تھا جو کہا تھا)، لیکن یہ (شخص) وہ (نبی) نہیں ہے۔

۱۔ مطلب یہ ہے کہ ایک پیغمبر آکر اِس کی منادی کرے گا۔ یہ آخری منادی ہو گی۔ اِس کے بعد قیامت ہی کا انتظار کیا جائے گا۔ اُس کے اور قیامت کے درمیان پھر کوئی دوسری نبوت نہیں ہے۔

۲۔ اِس سے واضح ہے کہ اُس زمانے میں یہود کے علما جانتے تھے کہ آخری پیغمبر کی بعثت اب زیادہ دور نہیں ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۱۵۸۴۱ سے لیا گیا ہے، اس کے تنہا راوی بدری صحابی سلمہ بن سلامہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ اِس کے متابعات درج ذیل کتب میں منقول ہیں:

سیرۃ ابن ہشام ۱/ ۲۱۲۔ تاریخ کبیر، بخاری، رقم ۱۳۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۷۶۴۔ دلائل النبوۃ، بیہقی، رقم ۴۱۳۔

۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۷۶۴ میں ’فَقَالَ: ذَلِكَ لِقَوْمٍ أَهْلِ شِرْكٍ أَصْحَابِ أَوْثَانٍ‘ کے بجائے ’فَقَالَ ذَلِكَ فِي أَهْلِ يَثْرِبَ، وَالْقَوْمُ أَصْحَابُ أَوْثَانٍ‘ ”اس نے یہ باتیں اہل یثرب کے بارے میں کی تھیں، جب کہ یہ لوگ بت پرست تھے۔“ کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۔ دلائل النبوۃ، بیہقی، رقم ۴۱۳ میں ’وَيْحَكَ يَا فُلَانُ‘ کے بجائے ’وَيْلَكَ يَا فُلَانُ‘ ”اے فلاں تو ہلاک ہو“ کے الفاظ منقول ہیں۔

۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۷۶۴ میں ’وَ أَشَارَ بِيَدِهِ نَحْوَ مَكَّةَ وَالْيَمَنِ‘ کے بجائے ’وَأَشَارَ بِيَدِهِ

إِلَى مَكَّةَ''اور اپنے ہاتھ سے مکہ کی جانب اشارہ کیا'' کے الفاظ ہیں۔

ــ۳ــ

عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ عَنْ أَشْيَاخٍ مِنْهُمْ قَالُوا:[1] فِينَا وَاللّٰهِ وَفِيهِمْ، يَعْنِي فِي الْأَنْصَارِ وَفِي الْيَهُودِ الَّذِينَ كَانُوا جِيرَانَهُمْ، نَزَلَتْ هَذِهِ الْقِصَّةُ، يَعْنِي ﴿**وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا**﴾[2]، قَالُوا: كُنَّا قَدْ عَلَوْنَاهُمْ دَهْرًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَنَحْنُ أَهْلُ الشِّرْكِ، وَهُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ، فَكَانُوا يَقُولُونَ: إِنَّ نَبِيًّا الْآنَ مَبْعَثُهُ قَدْ أَظَلَّ زَمَانُهُ، يَقْتُلُكُمْ قَتْلَ عَادٍ وَإِرَمَ. فَلَمَّا بَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰى ذِكْرُهُ رَسُولَهُ مِنْ قُرَيْشٍ وَاتَّبَعْنَاهُ كَفَرُوا بِهِ. يَقُولُ اللّٰهُ: ﴿**فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ**﴾....[3]

عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری اپنے قبیلے کے بزرگ صحابہ سے روایت کرتے ہیں، وہ بتاتے تھے: بخدا، یہ آیت ہم انصار کے لوگوں اور ہمارے اِن یہودی پڑوسیوں ہی کے بارے میں نازل ہوئی تھی کہ 'وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'، ''اور جب اللہ کی طرف سے ایک کتاب اِن کے پاس آئی، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِن کے ہاں موجود ہیں، اور اِس سے پہلے یہ (اُسی کے حوالے سے) اپنے دین کا انکار کرنے والوں کے خلاف فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے''۔

انصار کے بزرگ بتاتے تھے کہ ہم زمانۂ جاہلیت میں ان پر غالب ہوا کرتے تھے، گو (اُس

وقت) ہم مشرک تھے اور یہ اہل کتاب، (اپنی اِس مغلوبی کو دیکھ کر) اُس وقت ہم سے کہا کرتے تھے: اب ایک نبی کو مبعوث ہونا ہے، بس اُس کا دور آنے ہی والا ہے۔ وہ تم (مشرکوں) کو عاد اور ارم کی طرح قتل کرے گا[1]۔ پھر جب اللہ نے — اُس کا ذکر بلند ہو — اپنے رسول کو قریش میں سے مبعوث کیا تو ہم نے اُن کی پیروی کی، لیکن اِنھوں نے آپ کا انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ (اِسی حوالے سے) فرماتا ہے: ''پھر جب وہ چیز اِن کے پاس آئی، جسے خوب پہچانے ہوئے تھے تو یہ اُس کے منکر ہو گئے''...۔

ا۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن نے پیغمبروں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جزا و سزا کے جو واقعات بیان کیے ہیں، اُس زمانے کے یہود بھی اُن سے خوب واقف تھے اور مشرکین بھی۔

متن کے حواشی

ا۔ اس روایت کا متن تفسیر طبری، رقم ۱۵۱۹ سے لیا گیا ہے، اس کے تنہا راوی عاصم بن عمر بن قتادہ ہیں۔ اِس کا ایک ہی متابع ہے، جو دلائل النبوۃ، رقم ۴۰۹ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ البقرہ ۲: ۸۹۔

۳۔ البقرہ ۲: ۸۹۔

— ۴ —

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ:[1] حَارَبَتِ النَّضِيرُ وَقُرَيْظَةُ، فَأَجْلَى بَنِي النَّضِيرِ، وَأَقَرَّ قُرَيْظَةَ وَمَنَّ عَلَيْهِمْ، حَتَّى حَارَبَتْ قُرَيْظَةُ، فَقَتَلَ رِجَالَهُمْ، وَقَسَمَ نِسَاءَهُمْ وَأَوْلَادَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بَيْنَ الْمُسْلِمِينَ إِلَّا بَعْضَهُمْ لَحِقُوا بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَآمَنَهُمْ وَأَسْلَمُوا، وَأَجْلَى يَهُودَ الْمَدِينَةِ كُلَّهُمْ: بَنِي قَيْنُقَاعٍ، وَهُمْ رَهْطُ عَبْدِ اللّٰه بْنِ سَلَامٍ، وَيَهُودَ بَنِي حَارِثَةَ، وَكُلَّ يَهُودِ الْمَدِينَةِ.

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں: (ایک موقع پر) بنو نضیر اور بنو قریظہ نے (نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ کے باوجود) جنگ کی تو آپ نے بنو نضیر کو جلاوطن کر دیا اور بنو قریظہ پر احسان کرتے ہوئے، اُنھیں مدینے ہی میں رہنے دیا۔ حتیٰ کہ بنو قریظہ نے پھر جنگ کر ڈالی تو آپ نے اُن کے مردوں کو قتل کر دیا اور اُن کی عورتوں، بچوں اور اُن کے اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ بنو قریظہ کے بعض افراد، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے تو آپ نے اُنھیں پناہ دی اور اُنھوں نے اسلام قبول کر لیا[1]۔ تاہم مدینہ کے تمام یہودیوں: عبد اللہ بن سلام کے قبیلے بنو قینقاع، بنو حارثہ کے یہود، غرض مدینہ کے سبھی یہودیوں کو آپ نے بالآخر جلاوطن کر دیا۔

۱۔ یعنی اُسی شہادت کی بنا پر اسلام قبول کر لیا، جس کا ذکر پیچھے روایتوں میں ہوا ہے۔

متن کے حواشی

۱۔ اس روایت کا متن صحیح بخاری، رقم ۴۰۲۸ سے لیا گیا ہے۔ اس کے تنہا راوی عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ اس کے متابعات درج ذیل کتب میں دیکھے جا سکتے ہیں:

مصنف عبد الرزاق، رقم ۹۹۸۸۔ مسند احمد، رقم ۶۳۶۷۔ صحیح مسلم، رقم ۱۷۶۶۔ سنن ابی داؤد، رقم ۳۰۰۵۔ مسند بزار، رقم ۵۹۲۳۔ المنتقی، ابن جارود، رقم ۱۱۰۰۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۶۷۰۲، ۶۷۰۴۔ الاوسط، ابن منذر، رقم ۶۶۹۳۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۲۸۵۳، ۱۸۰۲۱۔ دلائل النبوۃ، بیہقی ۳/۱۸۳۔

المصادر والمراجع

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الرازي. (١٤٢٧هـ/٢٠٠٦م). **العلل**. ط١. تحقيق: فريق من الباحثين بإشراف وعناية د/سعد بن عبد الله الحميد و د/ خالد بن عبد الرحمٰن الجريسي. الرياض: مطابع الحميضي.

ابن أبي حاتم عبد الرحمٰن الحنظلي. (١٢٧١هـ/١٩٥٢م). **الجرح والتعديل**. ط١. حيدر آباد الدكن. الهند: طبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

ابن أبي عاصم أحمد بن عمرو الشيباني. (١٤١١ھ/١٩٩١م). **الآحاد والمثاني**. ط١. تحقيق: د.باسم فيصل أحمد الجوابرة. الرياض: دار الراية.

ابن الجارود،أبو محمد عبد الله النيسابوري. (١٤٠٨ھ/١٩٨٨م). **المنتقى من السنن المسندة**. ط١. تحقيق:عبد الله عمر البارودي. بيروت:مؤسسة الكتاب الثقافية.

ابن حبان محمد بن حبان. (١٤٢٠ھ/٢٠٠٠م). **المجروحين من المحدثين**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفى. دار السميعي.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٦ھ/١٩٨٦م). **لسان الميزان**. ط٣. تحقيق: دائرة المعرف النظامية الهند. بيروت: مؤسسة الأعلمي للمطبوعات.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤١٧ھ/١٩٩٧م). **تحرير تقريب التهذيب**. ط١. تاليف: الدكتور بشار عواد معروف، الشيخ شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **طبقات المدلسين**. ط١. تحقيق: د. عاصم بن عبدالله القريوتي. عمان: مكتبة المنار.

ابن حجر أحمد بن علي العسقلاني. (١٤٠٤ھ/١٩٨٤م). **النكت على كتاب ابن الصلاح**. ط١. تحقيق: ربيع بن هادي المدخلي. المدينة المنورة، المملكة العربية السعودية: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

ابن رجب عبد الرحمٰن السَلامي. (١٤٠٧ھ/١٩٨٧م). **شرح علل الترمذي**. ط١. تحقيق: الدكتور همام عبد الرحيم سعيد. الأردن: مكتبة المنار (الزرقاء).

ابن عدي عبد الله بن عدي الجرجاني. (١٤١٨ھ/١٩٩٧م). **الكامل في ضعفاء الرجال**. ط١. تحقيق: عادل أحمد عبد الموجود، علي محمد معوض. بيروت: الكتب العلمية.

ابن الكيال ابو البركات محمد بن احمد. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الكواكب النيرات**. ط٢. تحقيق: عبد القيوم عبد رب النبي. مكة مكرمة: المكتبة الإمدادية.

ابن المِبْرَد يوسف بن حسن الحنبلي. (١٤١٣ھ/١٩٩٢م). **بحر الدم فيمن تكلم فيه الإمام أحمد بمدح أو ذم**. ط١. تحقيق وتعليق: الدكتورة روحية عبد الرحمٰن السويفي. لبنان، بيروت:

دار الكتب العلمية.

ابن المديني علي بن عبد الله السعدي. (١٩٨٠م). **العلل**. ط٢. تحقيق: محمد مصطفى الأعظمي. بيروت: المكتب الإسلامي.

ابن معين يحيى بن معين البغدادي. (١٣٩٩ھ/١٩٧٩م). **تاريخ ابن معين**. ط١. تحقيق: د. أحمد محمد نور سيف. مكة المكرمة: مركز البحث العلمي وإحياء التراث الإسلامي.

ابن المندر، ابو بكر محمد بن ابراهيم. (١٤٣١ھ/٢٠١٠م). **الأوسط من السنن والإجماع والاختلاف**. ط٢. مراجعة و تعليق: احمد بن سليمان. تحقيق: ياسر بن كمال. الناشر: دار الفلاح. مصر.

ابن هشام عبد الملك بن هشام. (١٣٧٥ھ/١٩٥٥م) **السيرة النبوية**. ط٢. تحقيق: مصطفى السقا وإبراهيم الأبياري وعبد الحفيظ الشلبي. شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي.

أبو اسحاق الحويني. (١٤٣٣ھ/٢٠١٢م). **نثل النبال بمعجم الرجال**. ط١. جمعه ورتبه: أبو عمرو أحمد بن عطية الوكيل. مصر: دار ابن عباس.

أبو داود سليمان بن الأشعث السَّجِسْتاني. (١٤٠٣ھ/١٩٨٣م). **سؤالات أبي عبيد الآجري أبا داود السجستاني في الجرح والتعديل**. ط١. تحقيق: محمد علي قاسم العمري. المدينة المنورة: عمادة البحث العلمي بالجامعة الإسلامية.

أبو عوانة يعقوب بن إسحٰق. (١٤١٩ھ/١٩٩٨م). **المستخرج**. ط١. تحقيق: أيمن بن عارف الدمشقي. بيروت: دار المعرفة.

الآجُرِّيُّ محمد بن الحسين. (١٤٢٠ھ/١٩٩٩م). **الشريعة**. ط٢. تحقيق: الدكتور عبد الله بن عمر بن سليمان الدميجي. الرياض: دار الوطن.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢١ھ/٢٠٠١م). **المسند**. ط١. تحقيق: شعيب الأرنؤوط، وعادل مرشد، وآخرون. بيروت: مؤسسة الرسالة.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (١٤٢٢ھ/٢٠٠١م). **العلل و معرفة الرجال**. ط٢. تحقيق و تخريج: د وصي الله بن محمد عباس. الرياض: دار الخاني فرقد فريد الخاني.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (٢٠٠٩م). **التاريخ الكبير**. تحقيق: السيد هاشم الندوي. بيروت: دار الفكر.

البخاري محمد بن إسمٰعيل الجعفي. (١٣٩٧هـ/١٩٧٧م). **التاريخ الأوسط**. ط١. حلب. القاهرة: دار الوعي مكتبة دار التراث.

البخاري محمد بن إسمٰعيل.(١٤٢٢هـ). **الجامع الصحيح**. ط١. تحقيق: زهير الناصر. بيروت: دار طوق النجاة.

البزار أحمد بن عمرو. (٢٠٠٩م). **مسند البزار**. ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله، وعادل بن سعد، وصبري عبد الخالق الشافعي. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرى**. ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

البيهقي أحمد بن الحسين. (١٤٠٥هـ). **دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة**. ط١. بيروت: دار الكتب العلمية.

الحاكم محمد بن عبد الله المعروف بابن البيع. (١٤١١ هـ/١٩٩٠م). **المستدرك على الصحيحين**. ط١. تحقيق: مصطفى عبد القادر عطا. بيروت: دار الكتب العلمية.

خالد الرباط سيد عزت عيد. (١٤٣٠هـ/٢٠٠٩م). **الجامع لعلوم الإمام أحمد (الأدب والزهد)**. ط١. مصر: دار الفلاح للبحث العلمي وتحقيق التراث.

الدارقطني علي بن عمر. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **العلل الواردة في الأحاديث النبوية**. ط١. تحقيق وتخريج: محفوظ الرحمٰن زين الله السلفي. الرياض: دار طيبة.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٤١٣هـ/١٩٩٢م). **الكاشف في معرفة من له رواية في الكتب الستة**. ط١. تعليق: امام برهان الدين أبي الوفاء إبراهيم بن محمد. جدة: دار القبلة للثقافة الاسلامية، مؤسسة علوم القرآن.

الذهبي محمد بن أحمد. (١٣٨٧هـ/١٩٦٧م). **ديوان الضعفاء والمتروكين**. ط٢. تحقيق: حماد بن محمد الأنصاري. مكة: مكتبة النهضة الحديثة.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٨م). **الاغتباط بمن رمي من الرواة بالاختلاط**. ط١. تحقيق: علاء الدين علي رضا. القاهرة: دار الحديث.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٩٨٦م). **التبيين لأسماء المدلسين**. ط١. تحقيق: يحي

شفيق حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

سبط ابن العجمي برهان الدين الحلبي. (١٤٠٧هـ/١٩٨٧م). **الكشف الحثيث عمن رمي بوضع الحديث**. ط١. المحقق: صبحي السامرائي. بيروت: عالم الكتب، مكتبة النهضة العربية.

الطبري محمد بن جرير. (١٤٢٠هـ/٢٠٠٠م). **جامع البيان في تأويل القرآن**. ط١. تحقيق: احمد محمد شاكر. بيروت: مؤسسة الرسالة.

الطبراني سليمان بن أحمد. (١٤١٥هـ/١٩٩٤م). **المعجم الكبير**. ط١. تحقيق: حمدي بن عبد المجيد السلفي. القاهرة: مكتبة ابن تيمية.

عبد الرزاق بن همام الحميري. (١٤٠٣هـ). **المصنف**. ط٢. تحقيق: حبيب الرحمٰن الأعظمي. الهند: المجلس العلمي.

العجلي أحمد بن عبد الله. (١٤٠٥هـ/١٩٨٥م). **معرفة الثقات**. ط١. تحقيق: عبد العليم عبد العظيم البستوي. المدينة المنورة: مكتبة الدار.

محمد بن إسحاق المدنى. (١٣٩٨هـ/١٩٧٨م). **سيرة ابن إسحاق (كتاب السير والمغازي)**. ط١. تحقيق: سهيل زكار. بيروت: دار الفكر.

مسلم بن الحجاج النيسابوري. (د.ت). **الجامع الصحيح**. د.ط. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

مغلطاي علاء الدين بن قليج. (١٤٢٢هـ/٢٠٠١م). **إكمال تهذيب الكمال في أسماء الرجال**. ط١. تحقيق: أبو عبد الرحمٰن عادل بن محمد، أبو محمد أسامة بن إبراهيم. القاهرة: الفاروق الحديثة للطباعة والنشر.

ساجد حمید

’لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ‘؟

(۳)

نظائر قرآنی

سورۂ قیامہ کی ان آیات کی تفسیر میں سورۂ طٰہٰ کی آیت ’وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا‘ (۲۰: ۱۱۴) سے بھی مفسرین نے مدد لی ہے، بلکہ اس کے برعکس ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منسوب روایت کی روشنی میں سورۂ قیامہ اور سورۂ طٰہٰ کی آیات کو سمجھا گیا ہے، یعنی دونوں کو ایک روایت کی روشنی میں سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس آیت کو بھی سمجھا جائے۔ یہ جس مقام پر آئی ہے، اس کا قریبی (immediate) مضمون چند آیات پر مشتمل ہے:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا. فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا. وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا.

(۲۰: ۱۱۳-۱۱۵)

’وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ‘ کے معنی

اس کے معنی یہ بتائے گئے ہیں: جب تک آپ پر قرآن بیان نہ کر دیا جائے آپ اسے کسی کو نہیں سنائیں گے

(ابن عباس اور مجاہد طبری)۔ جب تک آپ پر قرآن مکمل نہ کر دیا جائے آپ اسے کسی کو نہیں سنائیں گے (ابن جریج، طبری)۔ جب تک اس کا بیان مکمل نہ کر دیا جائے آپ اس کی تلاوت نہیں کریں گے (قتادہ، طبری)۔ جب جبریل وحی لاتے ہیں تو وہ سہج کام کرتے ہیں تاکہ آپ کو اچھی طرح سنالیں اور سمجھالیں، اس کے بعد آپ اسے یاد کیا کریں، آپ جبریل سے قراءت میں منازعت نہ کیا کریں (زمخشری)۔

اوپر کے اقوال سے واضح ہے کہ سورۂ قیامہ کے اثر میں یہاں پر 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ' کے مضمون کو مقدر مانا گیا ہے، حالاں کہ یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے 'لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ' میں 'الْقُرْاٰنِ' کو قرآن مجید کے بجائے قراءت کے معنی میں لے لیا گیا ہے، یعنی آپ قراءت میں جلدی نہ کریں۔ اوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'عجل به' میں صرف دو مفہوم ہیں: ایک یہ کہ وقت سے پہلے کوئی چیز طلب کرنا یا کر گزرنا، دوسرے تیز رفتاری سے کوئی کام کر دینا۔ اب قرآن کے مصدری اور اسمی، دونوں اعتبار سے دونوں مفاہیم کو لیں تو یہ تراجم بنیں گے: وقت سے پہلے تلاوت طلب نہ کیجیے، تیزی سے تلاوت مت کیجیے، وقت سے پہلے تلاوت مت کیجیے۔ قرآن کو کتاب کے معنی میں لے کر ترجمہ کریں تو یوں ہو گا: وقت سے پہلے قرآن کا اترنا طلب نہ کیجیے، تیزی سے قرآن طلب نہ کیجیے، تیزی سے قرآن مجید نہ کریں، وقت سے پہلے قرآن نہ کیجیے۔ ان معانی میں سے چار مفاہیم، اگر جملہ سیاق وسباق سے الگ کر لیا جائے تو لسانی اعتبار سے ان کا متحمل ہو سکتا ہے:

۱۔ سرعت سے تلاوت مت کیجیے۔

۲۔ وقت سے پہلے تلاوت نہ کیجیے۔

۳۔ وقت سے پہلے قرآن کا اترنا طلب نہ کیجیے۔

۴۔ تیزی سے قرآن طلب نہ کیجیے۔

اب ان معانی کو باقی جملے کے ساتھ رکھیں تو دیکھیے کہ دونوں جملے کس مفہوم کو قبول کرتے ہیں:

۱۔ اس کی وحی مکمل ہونے سے پہلے تیزی سے تلاوت مت کیجیے۔

۲۔ اس کی وحی مکمل ہونے سے پہلے تلاوت نہ کیجیے۔

۳۔ اس کی وحی مکمل ہونے سے پہلے قرآن کا اترنا طلب نہ کیجیے۔

۴۔ اس کی وحی مکمل ہونے سے پہلے تیزی سے قرآن طلب نہ کیجیے۔

پہلے معنی: ''تیزی وسرعت سے تلاوت کرنا'' دل کو نہیں لگتے، اس لیے کہ تلاوت میں سرعت سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا ہو گی۔ مثلاً تیز رفتار سے کلام کو دہرانا؟ یاد کرنا تو مسئلہ نہیں تھا تو پھر تیزی سے دہرانا بے مقصد و

بے معنی ہے۔ اگر رقت یا قرآن کی اثر پذیری سے ایسا ہوتا تھا کہ ادھر وحی نازل ہوئی اور ادھر آپ اسے دہرانے لگتے تو سرعت اس کے لیے بھی کوئی پہلو نہیں رکھتی۔

دوسرے معنی: ''وقت سے پہلے تلاوت''، بھی دل کو لگتے نہیں ہیں، خواہ تلاوت کرنے کے معنی دوسروں کو سنانے کے لیے جائیں یا خود یاد کرنے کے لیے دہرانے کے۔ پہلی بات اس لیے کہ یہ ممکن نہیں کہ وقت سے پہلے تلاوت کر لی جائے، اس لیے کہ قرآن اترے گا تو تلاوت ہو گی۔ دوسرے یہ کہ جبریل وحی اتار رہے ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سنانے نکل جائیں، اور اگر محض لوگوں کو جلد از جلد سنانے کی تمنا دل میں اٹھتی ہو تو اول تو یہ محمود جذبہ ہے اور ثانیاً یہ کہ اس سے روکنے کے لیے یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ رہا یاد کرنے کے لیے تلاوت تو یہ ہم سورۂ قیامہ کی آیت میں بات کر چکے ہیں کہ یاد کرنے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو احتیاج نہیں تھی۔ یہ معنی بھی کچھ جچتے نہیں کہ آپ ہر آیت کے اترتے ہی بلا توقف تلاوت شروع کر دیتے تھے۔

تیسرے معنی: ''وقت سے پہلے قرآن کے اترنے کی طلب''، نظائر قرآنی اور دعوت قرآن کے مہمات سے تعلق رکھتے محسوس ہوتے ہیں، بلکہ اس کے بعد کا 'وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا' والا جملہ بھی اس کی تائید کرتا معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کے جلد جلد اترنے کی طلب کو علم کی طلب میں سمو دیا گیا ہے۔ البتہ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ سورۂ قیامہ میں آپ کو قرآن طلب کرنے سے روک دیا گیا تھا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اس حکم کی خلاف ورزی کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں قرآن کی طلب سے نہیں روکا گیا تھا، بلکہ عجلت بالقرآن کے لیے زبان کی حرکت سے روکا گیا تھا، یعنی آپ کو روکا گیا تھا کہ آپ قرآن جلد از جلد پورا نازل کرنے کا مطالبہ نہ کریں۔ تو یہاں اس کی کوئی نشان دہی نہیں ہے کہ آپ نے اس کی خلاف ورزی کی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں اسلوب کلام تعلیم وتذکیر کا ہے، کسی کیے گئے عمل پر نقد و تنبیہ کا نہیں ہے۔ یہ ویسا ہی اسلوب ہے جس میں آپ کو نصیحت کی گئی ہے کہ آپ صبر سے کام لیں گے اور خدا کے فیصلے سے پہلے کوئی اقدام نہیں کریں گے، جب کہ یہ معلوم ہو کہ ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر جانے لگے ہوں۔ تو گویا سورۂ طٰہٰ میں 'وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ' کا حکم سورۂ قیامہ والے حکم کی یاددہانی تھی، جس میں قصۂ آدم سے نصیحت کو مؤثر کیا گیا ہے، جیسے خدا کے فیصلے کے انتظار کے حکم کو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے[16]، اور ایک مقام پر

۱۶۔ مثلاً دیکھیے سورۂ یونس (۱۰) کی یہ آیت: 'وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ' (۱۰۹)۔

اسے قصۂ یونس سے مؤکد کیا گیا ہے[۱۷]۔ ایسا کرنے سے کہیں، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاددہانی پیش نظر ہوتی[۱۸] اور کہیں درحدیث دیگراں قریش کو تنبیہ ہوتی تھی[۱۹]۔

چوتھے معنی: ''تیزی سے قرآن طلب کرنا'' کہ طلب قرآن کا مطالبہ تیزی سے کیا جائے، گو جملہ تحمل کرتا ہے، لیکن اوپر سورۂ قیامہ میں ٹھیک یہی بات تھی، جس سے آپ کو روک دیا گیا تھا۔ اس لیے اس کا امکان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہی ہے کہ منع کرنے کے باوجود زبان کو ہلا ہلا کر قرآن جلد طلب کریں، اس لیے یاددہانی بھی اسی بات کی ہوتی ہے جس کا خدشہ ہو، حرکت زبان ایسی بات بھی نہیں تھی کہ جس کے دوبارہ ظہور کا امکان ہو، جب کہ قرآن کے جلد اترنے کی تمنا کا نہ صرف امکان تھا، بلکہ دعوت و تبلیغ کی قدم بہ قدم ناگزیر ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ 'وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا' والے جملے سے صاف ظاہر ہے کہ طلب قرآن کی عجلت ہی زیر بحث ہے، نہ کہ زبان کو تیز تیز حرکت دے کر طلب قرآن والی صورت زیر بحث ہے۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ' کے معنی

اس میں اصل سوال اتنا ہے کہ یہ پورے قرآن سے متعلق ہے یا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیات جو اتر رہی تھیں، ان سے متعلق ہے؟ آیئے، اس سوال کا جواب قدیم مفسرین سے لیتے ہیں۔

آپ قرآن کی تلاوت نہ کیا کریں جب تک جبریل آپ تک وحی پہنچا نہ لیں (جلالین)۔ جب تک آپ پر قرآن بیان نہ کر دیا جائے آپ اسے کسی کو نہیں سنائیں گے (ابن عباس اور مجاہد طبری)۔ جب تک آپ پر قرآن مکمل نہ کر دیا جائے آپ اسے کسی کو نہیں سنائیں گے (ابن جریج، طبری)۔ جب تک اس کا بیان مکمل نہ کر دیا جائے آپ اس کی تلاوت نہیں کریں گے (قتادہ، طبری)۔ جب جبریل وحی لاتے ہیں، تو وہ سہج کام کرتے ہیں تاکہ آپ کو اچھی طرح سنا لیں اور سمجھا لیں، اس کے بعد آپ اسے یاد کیا کریں، آپ جبریل سے قراءت میں مسابقت نہ کیا کریں (زمخشری)۔

۱۷۔ مثلاً دیکھیے سورۂ قلم (۶۸) کی یہ آیات: 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ. لَوْلَاۤ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ' (۴۸-۴۹)۔

۱۸۔ مثلاً دیکھیے سورۂ طور (۵۲) کی یہ آیت: 'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ' (۴۸)۔

۱۹۔ مثلاً دیکھیے سورۂ دہر (۷۶) کی یہ آیت: 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا' (۲۴)۔

یہ تمام آرا، صاف ظاہر ہے کہ وقتی وحی کے حوالے سے بات کر رہی ہیں یا یوں کہیے کہ یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جب بھی وحی نازل ہو تو آپ اسے نہ تلاوت کریں گے، نہ کسی اور کو سنائیں گے اور نہ یاد کرنے کے لیے دہرائیں گے جب تک کہ اترنے والی وحی مکمل نہ ہو جائے۔ اوپر ہم بات کر چکے ہیں کہ یہ قابل فہم بات نہیں کہ وحی کے مکمل ہونے سے پہلے ہی آپ دوسروں کو سنانے لگیں، یہ فطرت کے خلاف ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی شخصیت بات پوری ہونے سے پہلے دوسروں کو سنانے کے لیے اٹھ جائے۔ اسی طرح یاد کرنے کی آپ کو ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا یہ تمام تفاسیر قرآن سے نہیں، بلکہ ان روایات سے پھوٹی ہیں جن میں خود سے سوچ لیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور نزول وحی کا معاملہ کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ابن عباس سے منسوب ایک تفسیر سے یہ سب تفاسیر پھوٹی ہیں، جس میں نصوص قرآن کا خیال نہیں رکھا گیا۔

اس آیت کا صاف اور سادہ مطلب صرف اتنا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی رفتار سے نازل ہونا ہے۔ جب اس کی وحی کی تکمیل ہونی ہے، قرآن اسی وقت پورا ہو گا، آپ اس سے پہلے اسے جلدی نہیں پا سکتے۔

عجلت بالقرآن کی ضرورت

اس کی چند وجوہات ذیل میں عرض کی جاتی ہیں:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو گراں قدر ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس کے لیے ہر نئی صورت حال یا مراحل میں آپ کو ہدایات کی ضرورت ہوتی تھی۔ مثلاً:

o آپ پر ایک گراں بار ذمہ داری عائد ہونے کو ہے: 'اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡكَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا' (المزمل ۷۳:۵)۔

o آپ کو پیش آمد دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے آگاہی، اور تسلی: 'وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ؕ وَكَفٰی بِرَبِّكَ هَادِیًا وَّنَصِیۡرًا' (الفرقان ۲۵:۳۱)۔

o آپ کے انذار کی اسکیم الٰہی کا بیان، اور اس کی تکمیل کے مظاہر کی نشان دہی: 'وَاِنۡ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِیۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ. اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ یَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ' (الرعد ۱۳: ۴۰-۴۱)۔

o آپ کو ہجرت جیسے عملی اقدام کا حکم، اور اس کے بعد نکلنے والے نتائج کی نشان دہی: 'وَقُلۡ رَّبِّ

اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا. وَقُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ ؕ اِنَّ الۡبَاطِلَ كَانَ زَهُوۡقًا‘(بنی اسرائیل ۱۷: ۸۰-۸۱)

o مکہ میں گھرے ہوئے مومنین کی مدد کا حکم: ’وَمَا لَكُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ هٰذِهِ الۡقَرۡیَةِ الظَّالِمِ اَهۡلُهَا ۚ وَاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِیًّا ۚۙ وَّاجۡعَلۡ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِیۡرًا‘(النساء ۴: ۷۵)۔وغیرہ

۲۔ قرآن کا زیادہ سے زیادہ نزول آپ کی انذار کی ذمہ داری ادا کرنے میں ایک ناگزیز ضرورت تھی۔ یہ معلوم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ قرآن کے ذریعے سے انذار کریں گے[۲۰]۔ اس لیے انذار کو آگے بڑھانے کے لیے ہر روز نئی وحی کی ضرورت ہوتی تھی۔

۳۔ جب کوئی ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوتا جس سے کوئی غلط فہمی پیدا ہوتی اور اس سے ہونے والی فضا سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے ہدایت الٰہی کی ضرورت ہوتی:

o مثلاً رومیوں کی شکست اور ایرانیوں کی فتح کے واقعے پر الٰہی توجیہ: ’غُلِبَتِ الرُّوۡمُ. فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ. فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَیَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ. بِنَصۡرِ اللّٰهِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ‘ (الروم ۳۰: ۲-۵)۔

o مثلاً احد پر تبصرہ: ’وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ. اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِیُّهُمَا ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلۡیَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ. وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ. اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَلَنۡ یَّكۡفِیَكُمۡ اَنۡ یُّمِدَّكُمۡ رَبُّكُمۡ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُنۡزَلِیۡنَ. بَلٰۤی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَیَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا یُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیۡنَ‘(آل عمران ۳: ۱۲۱-۱۲۵)۔وغیرہ

۴۔ اسی طرح بہت سے سوالات اور اعتراضات فضا میں موجود ہوتے تھے، جن پر اللہ کے رد عمل کی بہت

۲۰۔ مثلاً، سورۂ انعام میں ارشاد ہے: ’وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ‘(۶: ۱۹)، یا مثلاً: ’اِنَّمَآ اُنۡذِرُكُمۡ بِالۡوَحۡیِ‘(الانبیاء ۲۱: ۴۵) وغیرہ۔

اہمیت ہوتی تھی تاکہ مسلمانوں کو صحیح زاویۂ نگاہ عطا ہو۔

o مثلاً عذاب کے مطالبہ پر عذاب نازل نہ کیے جانے کی توجیہ: 'وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ' (یونس ۱۰:۱۱)۔

o مثلاً خدا کے قول فیصل کی سبقت کا اصول: 'وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ. وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ' (یونس ۱۰: ۱۹-۲۰)۔

o اللہ کے فیصلہ کر دینے کے مطالبہ کا رد، قرآنی دعوت کے لیے بے حسی: 'هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ' (البقرہ ۲:۲۱۰)۔ وغیرہ

۵۔ بعض مطالبات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کیا جا رہا ہوتا تھا، اس میں لوگوں کو روکنے کے لیے خدا کی رہنمائی نازل ہونا ضروری ہوتا تھا۔ مثلاً:

o فرشتوں کے اترنے کا مطالبہ: 'وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ' (الانعام ۶:۸)۔

o قرآن کے نجماً نجماً اترنے پر اعتراض کا مواجہہ: 'وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا' (بنی اسرائیل ۱۷:۱۰۶)۔

o آپ کی دعوت کو مسلسل جھٹلانے پر آپ کی پریشانی کا ازالہ، مثلاً: 'فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ' (الشعراء ۲۶:۶)۔ وغیرہ

۶۔ بہت سے فتنے شر پسند پیدا کر دیتے تھے جن کے لیے خدا کی طرف سے مداخلت ضروری ہو جاتی تھی۔

o مثلاً واقعۂ افک میں اللہ کا فیصلہ: 'اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ

بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ. لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ. وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ. وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ‘(النور ۲۴: ۱۱-۱۶)

o مثلاً مدینہ میں شر پسندوں نے جب سنسنی پھیلا رکھی تھی: ’لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا‘(الاحزاب ۳۳: ۶۰)۔ وغیرہ

۷۔ ان ضرورتوں کے علاوہ ایک اعتراض قرآن اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یہ بھی تھا کہ قرآن یک بارگی کیوں نازل نہیں ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس اعتراض میں یہ باتیں مقدر implied تھیں کہ شاید یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم موقع بہ موقع راتوں کو جاگ کر تصنیف کرتے یا کوئی اور تصنیف کر کے آپ کو سکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا کلام نہیں، بلکہ خود تراشیدہ ہے۔ کفار کا یہ مطالبہ قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے: ’وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا‘ (الفرقان ۲۵: ۳۲)

یہ وہ چند پہلو ہیں جن سے ہر کوئی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ہر وقت یہ ضرورت موجود رہتی تھی کہ قرآن مجید فوری طور پر نازل ہو جائے، اس لیے قرآن کی یہ نصیحت کی تکرار یا تاکید بے وجہ نہیں تھی: ’وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا‘ کہ قرآن تو اپنے وقت پر اترے گا، لیکن اس کی ضرورت جب محسوس ہو، آپ یہ دعا کیا کریں کہ ’رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا‘۔

خلاصہ

قرآن کی جلد جلد آمد کئی پہلوؤں سے مطلوب تھی۔ اس لیے آپ نے ایک دفعہ سورۂ قیامہ کی وحی کے نزول کے دوران میں خود بول کر قرآن کے جلد نازل کیے جانے کا مطالبہ کیا کہ مزید قرآن نازل کیا جائے۔ آپ

کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ آپ کا یہ مطالبہ ایک سچے نبی کا محمود مطالبہ تھا، اس لیے آپ کو روکنے کے بعد قرآن سے متعلق آپ کو آگاہ کیا گیا کہ قرآن مجید کے اترنے، جمع ہونے اور قراءت کرنے اور حسب موقع اسے بیان کرنے کا کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، آپ کو اس ضمن میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ان امور میں آپ کو طلب کی حاجت ہے۔ یہ کام ہمارے ہیں اور ہم کر کے رہیں گے۔ اس لیے آپ کو ارشاد ہوا کہ آپ قرآن کو جلد از جلد پانے کے مطالبہ میں زبان کو زحمت حرکت نہ دیجیے، ہم قرآن کی جمع و تالیف بھی کریں گے، اسے (نقاط و اعراب کے لحاظ سے) پڑھ کر بتائیں گے بھی۔ جب ہم پڑھا چکیں تو آپ اسی پڑھنے (اعراب و نقاط) کی پیروی کریں گے۔ صرف یہی نہیں مزید یہ بھی جان لیجیے کہ ہم حسب موقع جتنا اور جہاں چاہیے ہو گا، قرآن کو بیان بھی کریں گے۔ یہ سب تردد آپ کے نہیں ہیں۔

[باقی]

محمد وسیم اختر مفتی

مہاجرین حبشہ

(۳۱)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

قبیلہ و کنبہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری ہجرت سے انیس سال قبل (۶۰۲ء میں) یمن کے شہر زبید میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبداللہ تھا، قیس بن سلیمان (سلیم: ابن سعد، ابن عبدالبر) ان کے والد اور حضار بن حرب پر دادا تھے۔ جماہر بن اشعر بارھویں، بانی قبیلہ اشعر (اصل نام: نبت) بن ادد حضرت ابو موسیٰ کے تیرھویں اور کہلان بن سبا انیسویں جد تھے۔ قبیلہ مذحج کے بانی مالک بن ادد اشعر بن ادد کے بھائی تھے۔ ابن اسحٰق نے حمیر بن سبا کے بھائی اشعر بن سبا کو ان کا جد بتایا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب بائیسویں پشت پر یعرب بن قحطان سے جا ملتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعر قبیلہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اشعری اور اپنے جد اعلیٰ قحطان کی نسبت سے قحطانی کہلاتے ہیں۔ ذہبی نے ان کی نسبت تمیمی بھی بتائی ہے، جو کسی طور درست نہیں۔ ان کی والدہ حضرت ظبیہ بنت انس (طیبہ بنت وہب: ابن اثیر) عک قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، مشرف بہ ایمان ہوئیں اور مدینہ میں وفات پائی۔ ابن حزم نے حضرت ابو موسیٰ کے چار بھائی ابو رہم، ابراہیم، عامر ابو بردہ اور مجری بتائے ہیں (جمہرۃ انساب العرب ۳۹۷)۔

مکہ آمد، ورود حبشہ

واقدی کی روایت کے مطابق زمانۂ جاہلیت میں حضرت ابو موسیٰ اشعری اپنے بھائیوں اور اہل قبیلہ کی ایک

جماعت کے ساتھ مکہ آئے اور حضرت ابواحیحہ سعید بن العاص کے حلیف بن گئے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے حبشہ ہجرت کی اور فتح خیبر کے تین دن بعد حبشہ سے مدینہ پہنچے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری بنو عبد شمس کے عتبہ بن ربیعہ کی اولاد کے حلیف تھے۔ ابن اسحٰق اور واقدی نے حضرت ابوموسیٰ کو مہاجرین حبشہ میں شمار نہیں کیا۔

کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری حضرت سعید بن العاص سے حلف و پیمان کرنے کے بعد مکہ سے اپنے وطن واپس لوٹ گئے اور حبشہ ہجرت نہ کی۔ ۷ھ میں وہ اپنے بھائیوں، اشعر قبیلے کے پچاس اور قبیلہ عک کے دو افراد کے ساتھ اس وقت مدینہ پہنچے جب حبشہ سے حضرت جعفر بن ابوطالب کی آمد ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کی آمد سے پہلے فرمایا: تمھارے ہاں وہ قومیں آ رہی ہیں جو تم سے زیادہ نرم دل ہیں۔ اشعری مدینہ کے قریب پہنچے تو یہ شعر پڑھ رہے تھے:

غدًا نلقى الأحبة محمدًا وحزبه

”کل ہم دوستوں سے ملیں گے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے۔“

ان سب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کیا اور اسلام قبول کر کے آپ کی بیعت کی۔ یہ مصافحہ کرنے والے پہلے لوگ تھے (احمد، رقم ۱۲۵۸۲)۔ آپ کا ارشاد ہے: اشعریوں کا کسی غزوہ میں زاد راہ ختم ہونے لگتا ہے یا مدینہ میں ان کے اہل و عیال کی خوراک کم پڑ جاتی ہے تو وہ موجود تمام غلہ ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ہیں اور ایک برتن (پیمانے) کے ذریعے سے آپس میں برابر بانٹ لیتے ہیں۔ سو وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں (بخاری، رقم ۲۴۸۶۔ مسلم، رقم ۶۴۰۸)۔

مشہور روایت

حضرت ابوموسیٰ اشعری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ملی تو وہ اپنے دو بڑے بھائیوں حضرت ابوبردہ، حضرت ابورہم اور پچاس دیگر اشعریوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے مکہ جانے والی کشتی پر سوار ہوئے۔ دوسری روایت میں حضرت ابوعامر بن قیس اور حضرت محمد بن قیس دو بھائیوں کے ناموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ خود وہ روایت کرتے ہیں: ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خبر ملی تو ہم یمن میں تھے۔ ہم ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے ہمیں حبشہ میں نجاشی کے پاس پہنچا دیا۔ (یہاں ہماری ملاقات جعفر بن ابوطالب اور دوسرے مہاجرین سے ہوئی۔ جعفر نے بتایا کہ آپ نے انھیں حبشہ ہجرت کرنے اور

یہاں قیام کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے آپ بھی ہمارے ساتھ ٹھیر جائیں۔ چنانچہ ہم اشعری مہاجرین کے ساتھ حبشہ میں مقیم رہے) ہماری ملاقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ہوئی جب آپ نے خیبر فتح کیا۔

ابو عمر کہتے ہیں: درست بات یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ مکہ آئے، اسلام قبول کیا، بنو عبد شمس سے مخالفت کی اور اپنے وطن لوٹ گئے۔ ان کی دعوت پر پچاس اشعری حلقۂ بگوش اسلام ہو گئے تو وہ انھیں مکہ لانے کے لیے کشتی پر سوار ہوئے، لیکن سمندری ہوا نے ان کی کشتی ملک نجاشی حبشہ پہنچا دی۔ وہاں وہ ایک مدت قیام کرنے کے بعد حضرت جعفر بن ابو طالب کے ساتھ دو کشتیوں، سفینۂ جعفر اور سفینۂ اشعریین میں سوار ہو کر غزوۂ خیبر کے وقت مدینہ پہنچے۔

مہاجرین حبشہ کی فضیلت

حضرت عمر نے جب مہاجرۂ حبشہ حضرت اسماء بنت عمیس کے بارے میں تبصرہ کیا کہ یہ حبشیہ اور سمندر پار رہنے والی ہیں تو وہ غصے میں آگئیں اور کہا: واللہ، میں کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی، جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر نہ کر دوں۔ آپ نے فرمایا: عمر کا مجھ پر تم سے زیادہ حق نہیں۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے تو ایک ہجرت کی، تم کشتی والوں نے دو ہجرتیں کیں، ایک نجاشی کی طرف اور ایک میری طرف۔ حضرت اسماء بتاتی ہیں کہ ابو موسیٰ اشعری اور کشتیوں میں میرے ہم سفر مہاجرین حبشہ میرے پاس جمع ہوتے اور مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں پوچھتے۔ دنیا میں اس سے بڑھ کر انھیں کوئی خوشی ہوئی تھی نہ ان کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے زیادہ کسی شے کی وقعت تھی (بخاری، رقم ۴۲۳۰-۴۲۳۱۔ مسلم، رقم ۲۵۰۳۔ احمد، رقم ۱۹۵۲۴۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۴۰۹۔ دلائل النبوة ۴/ ۲۴۵)۔ ابو موسیٰ مجھ سے یہ فرمان نبوی بار بار سنتے۔

شہر رسول کی طرف ہجرت

۷ھ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ میں رہ جانے والے مہاجرین کو واپس لانے کے لیے حضرت عمرو بن امیہ ضمری کو بھیجا اور نجاشی نے ان کے سفر کے لیے دو کشتیاں فراہم کیں تو ایک کشتی میں حضرت جعفر بن ابو طالب اور دیگر مہاجرین اور دوسری میں حضرت ابو موسیٰ اپنے پچاس ہم قبیلہ اشعریوں کے ساتھ سوار ہوئے۔ مہاجرین بحیرۂ احمر (بحیرۂ قلزم) میں سفر کرنے کے بعد بولا کے ساحل پر اترے اور اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے۔ تب خیبر فتح ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابھی خیبر میں تھے۔ یہ غزوات میں ان کی پہلی حاضری

تھی۔ ایک روایت کے مطابق آپ نے مہاجرین کو مال غنیمت میں سے حصہ عطا کیا۔ کشتی کے مسافروں کے علاوہ آپ نے جنگ میں شرکت نہ کرنے والے کسی شخص کو مال غنیمت نہ دیا(احمد، رقم ۱۹۶۳۵)۔

حضرت ابوموسیٰ اور حبشہ سے آنے والے اشعریوں نے مدینہ کی وادی بقیع بطحان میں قیام کیا۔ ہر روز باری باری کچھ لوگ عشاء کی نماز پڑھنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے۔ ایک دن حضرت ابوموسیٰ اوران کے ساتھی مدینہ پہنچے۔ آپ کسی اہم کام میں مصروف تھے۔ آدھی رات ہو گئی تو آپ نماز پڑھانے کے لیے تشریف لائے۔ جماعت مکمل ہونے کے بعد فرمایا: اطمینان سے بیٹھو، میں تمھیں خوش خبری سناتا ہوں: اللہ کا تم پر احسان ہے کہ تمھارے علاوہ کوئی شخص اس وقت نماز ادا نہیں کر رہا۔ آپ کا ارشاد سن کر حضرت ابوموسیٰ اور ان کے ساتھی خوش خوش لوٹے (بخاری، رقم ۵۶۷۔ مسلم، رقم ۱۴۵۱)۔

غزوۂ خیبر

۷ھ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے واپسی پر ایک وادی میں سے گزرے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اور آپ کے ہم سفر دوسرے اصحاب کسی گھاٹی پر چڑھتے تو بلند آواز میں 'لا إله إلا الله والله أكبر' کا ورد کرتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو، رک جاؤ، تم ایسے خدا کو نہیں پکار رہے جو بہرا اور غائب ہے، وہ تمھارے ساتھ ہے، سمیع وقریب ہے (بخاری، رقم ۲۹۹۲۔ احمد، رقم ۱۹۵۲۰)۔ پھر آپ نے آواز دی: او عبداللہ بن قیس، حضرت ابوموسیٰ نے کہا: لبیک یارسول اللہ، فرمایا: میں تمھیں جنت کے خزانوں میں سے ایک کلمہ نہ بتادوں؟ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: کیوں نہیں، یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ فرمایا: 'لاحول ولا قوة إلا بالله' (بخاری، رقم ۴۲۰۵۔ مسلم، رقم ۶۸۶۲۔ ابوداؤد، رقم ۱۵۲۶۔ ترمذی، رقم ۳۳۷۴۔ ابن ماجہ، رقم ۳۸۲۴۔ احمد، رقم ۱۹۵۷۵)۔

غزوۂ ذات الرقاع

۴ھ (محرم ۵ھ: واقدی۔ ربیع الاول ۷ھ: بخاری): ایک نجدی مدینہ کے بازار میں اپنا سامان فروخت کرنے آیا تو اس نے بتایا کہ بنوغطفان کی شاخیں بنومحارب اور بنوثعلبہ مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر سن کر چار سو مسلمانوں کی فوج تیار کی اور حضرت ابوذر غفاری کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرما کر نجد کا رخ کیا۔ چھ اصحاب کے لیے ایک اونٹ تھا، جس پر وہ باری باری سوار ہوتے۔ کو ہ ذات الرقاع کی حدود میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنی عورتیں نیچے چھوڑی ہیں اور خود پہاڑوں

پر مورچہ بند ہو گیا ہے۔ اس غزوہ میں کوئی جنگ نہ ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دن وہاں ٹھیر کر مدینہ لوٹ آئے۔ اس اثنا میں نماز کا وقت ہوتا تو اندیشہ ہوتا کہ دشمن مورچوں سے اتر کر حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ آپ نے صلٰوۃ الخوف ادا فرمائی۔ غزوۂ ذات الرقاع کی ایک وجۂ تسمیہ یہ ہے کہ پہاڑی اور پتھریلی زمین پر پیدل چلنے کی وجہ سے صحابہ کے پاؤں زخمی ہو گئے اور ناخن جھڑ گئے تھے اور انھوں نے پاؤں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اس غزوہ میں شرکت کی۔ ہجرت کے چوتھے اور پانچویں سال وہ حبشہ میں تھے، اس لیے زیادہ تر اہل مغازی نے اس سن وقوع کو درست نہیں مانا۔ امام بخاری نے غزوۂ ذات الرقاع کا زمانۂ وقوع ۷ھ جنگ خیبر کے بعد متعین کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اس غزوہ کا ذکر کرنے سے گریز کرتے، کیونکہ وہ اپنے عمل کا اشتہار نہ چاہتے تھے (مسلم، رقم ۴۶۹۹)۔

سریۂ اوطاس

۸ھ (۶۳۰ء): جنگ حنین میں شکست کے بعد کفار طائف اور نخلہ کی طرف فرار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا پیچھا کرنے کے لیے حضرت ابو عامر عبید بن سلیم اشعری کی قیادت میں ایک سریہ روانہ کیا، ان کے بھتیجے حضرت ابو موسیٰ اشعری بھی ساتھ تھے۔ درید بن صمہ کی سربراہی میں بنو ہوازن کا ایک گروہ طائف کے راستے میں واقع اوطاس میں قلعہ بند ہو گیا تھا۔ حضرت ابو عامر اشعری نے اوطاس پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ نو سورماؤں کو دوبدو مقابلے میں قتل کرنے کے بعد انھوں نے سلمہ بن درید پر حملہ کیا، لیکن اس نے پلٹ کر انھیں شہید کر دیا اور علم ان سے چھین لیا۔ بخاری کی روایت میں وضاحت کی گئی ہے کہ ان کے گھٹنے میں بنو جشم کے ایک شخص کا پھینکا ہوا تیر پیوست ہو گیا۔ حضرت ابو موسیٰ نے پوچھا: چچا، آپ کو یہ تیر کس نے مارا؟ انھوں نے اشارے سے بتایا تو حضرت ابو موسیٰ نے حملہ آور کو جا لیا۔ وہ دوڑا تو انھوں نے پکار کر کہا: تجھے شرم نہیں آتی، تو ثابت قدم نہیں رہے گا۔ ان جملوں سے اسے غیرت آئی اور وہ پلٹ کر تلوار چلانے لگا۔ پھر حضرت ابو موسیٰ نے سبقت کی اور دو وار کر کے اسے جہنم رسید کر دیا۔ واپس آکر انھوں نے چچا کو بتایا تو انھوں نے پیوست تیر نکالنے کو کہا۔ زخم سے سیال بہ نکلا۔ حضرت ابو عامر نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہنا اور درخواست کرنا: میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ یہ کہہ کر حضرت ابو موسیٰ اشعری کو سالار مقرر کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی شہادت ہو گئی۔ حضرت ابو موسیٰ بنو ہوازن کو شکست دے کر خدمت رسالت میں پہنچے اور سریہ کے واقعات بتانے کے ساتھ حضرت ابو عامر کی درخواست پیش کی۔ آپ نے پانی منگوایا اور وضو کرنے کے بعد ہاتھ بلند کر کے

دعافرمائی: اے اللہ، عبید ابوعامر کی مغفرت کر دے، روز محشر اسے اکثر لوگوں سے بلند مقام عطا کرنا۔ حضرت ابو موسیٰ نے عرض کیا: میرے لیے بھی مغفرت کی دعا کر دیں۔ آپ نے دعا فرمائی: اے اللہ، عبد اللہ بن قیس کے گناہ بخش دے اور روز قیامت اس کو عمدہ گھر میں داخل کرنا (بخاری، رقم ۴۳۲۳۔ مسلم، رقم ۶۴۰۶۔ احمد، رقم ۱۹۵۶۷)۔ بلاذری نے حضرت ابو عامر کے قاتل کا نام سلمہ بن سمادری (یا سمادیر) بتایا ہے، یہ وہی سلمہ بن درید ہے جو اپنی ماں سمادری کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

بدو کی ناسمجھی

۸ھ: حضرت ابو موسیٰ اشعری بیان کرتے ہیں: ہم (حصار طائف کے بعد) مکہ و مدینہ کے مابین جعرانہ کے مقام پر تھے کہ ایک بدو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: آپ میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہ کریں گے؟ آپ نے فرمایا: تیرے لیے بشارت ہے۔ اس نے کہا: آپ نے مجھے کئی بار فرمایا ہے: خوش ہو جاؤ۔ اس پر آپ غصہ میں آ گئے اور حضرت ابو موسیٰ اور حضرت بلال کی طرف رخ کر کے فرمایا: اس دیہاتی نے تو بشارت کو مسترد کر دیا ہے، تم دونوں قبول کر لو۔ دونوں اصحاب نے کہا: ہم نے قبول کی۔ آپ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا، اپنے دونوں ہاتھ اور منہ اس میں دھوئے اور کلی بھی کی۔ پھر فرمایا: تم دونوں اس میں سے کچھ نوش کر لو، اپنے مونہوں اور اپنے سینوں پر بھی ڈال لو اور خوش ہو جاؤ۔ دونوں نے پیالہ پکڑ کر تعمیل ارشاد کیا تو پس پردہ حضرت ام سلمہ پکاریں: کچھ پانی اپنی ماں کے لیے بھی چھوڑ دینا۔ چنانچہ انھوں نے بقیہ پانی حضرت ام سلمہ کو دے دیا (بخاری، رقم ۴۳۲۳۔ مسلم، رقم ۶۴۰۵)۔

غزوۂ تبوک

۹ھ: غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت ابو موسیٰ اپنے کچھ اشعری ساتھیوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ پر جانے کے لیے سواریوں کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا: واللہ، میں سواریاں فراہم نہ کر سکوں گا، میرے پاس تمھیں سواری دینے کے لیے کچھ نہیں۔ اسی اثنا میں آپ کے پاس غنیمت کے اونٹ آئے تو آپ نے پوچھا: اشعری لوگ کہاں ہیں؟ (حضرت بلال نے منادی کی تو حضرت ابو موسیٰ خدمت رسالت میں دوبارہ پہنچے تو) آپ نے انھیں سفید کوہانوں والے پانچ اونٹ دینے کا حکم دیا۔ اونٹ لے کر انھوں نے سوچا: ہمیں کوئی برکت حاصل نہ ہو گی، اس لیے واپس پلٹے اور عرض کیا: آپ نے حلفاً کہا تھا کہ ہمیں سواریاں نہ دیں گے، کیا آپ کو یاد نہیں رہا؟ آپ نے فرمایا: تمھیں یہ سواریاں میں نے نہیں دیں،

بلکہ اللہ نے دی ہیں۔ واللہ، میں کوئی قسم نہیں کھاتا، مگر جب اس کے علاوہ بہتر صورت پاتا ہوں تو قسم کھول کر اسی کو انجام دیتا ہوں (بخاری، رقم ۳۱۳۳۔ مسلم، رقم ۴۲۶۳۔ نسائی، رقم ۳۸۱۱۔ ابن ماجہ، رقم ۲۱۰۷۔ احمد، رقم ۱۹۵۵۸)۔

یمن کی عمل داری

۱۰ھ: حجۃ الوداع سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن اور حضر موت کو کئی رقبوں میں بانٹ کر ہر حصے کا الگ عامل مقرر فرمایا۔ حضرت شہر بن باذام، حضرت عامر بن شہر ہمدانی، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت خالد بن سعید، حضرت طاہر بن ابوہالہ، حضرت یعلیٰ بن امیہ اور حضرت عمرو بن حزم (حرام: ابن کثیر) یمن کے عامل تھے۔ ابن جوزی نے حضرت طاہر بن ابوہالہ کا نام نہیں لکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو یمن کے زیریں صوبے اور ساحلی علاقوں کا گورنر مقرر کیا۔ یمن کا شہر مارب بھی حضرت ابو موسیٰ کی عمل داری میں تھا۔ حضرت معاذ بن جبل دوسرے صوبے اقصائے یمن کے نبوی عامل تھے۔ آپ کی وفات تک وہ اسی عہدے پر فائز رہے، پھر مدینہ آ گئے اور فتوحات شام میں حصہ لیا۔ خلیفہ بن خیاط نے حضرت ابو موسیٰ کو زبید، رمع، عدن اور ساحل کا نبوی عامل بتایا ہے (تاریخ خلیفہ ۹۷)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت معاذ بن جبل کو یمن روانہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی: آسانیاں پیدا کرنا، دشواریوں میں مبتلا نہ کرنا اور خوش خبری دینا، نفرت نہ دلانا۔ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینا۔ دونوں اپنے اپنے علاقے کا دورہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب آتے تو ملاقات اور سلام دعا کرتے۔ ایک ملاقات میں حضرت معاذ نے پوچھا: عبداللہ، آپ قرآن کس طرح پڑھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا: میں تھوڑا تھوڑا ہر وقت پڑھتا رہتا ہوں۔ اب حضرت ابو موسیٰ نے سوال کیا: معاذ، تو آپ کیسے تلاوت کرتے ہیں؟ انھوں نے بتایا: میں رات کی ابتدا میں سو جاتا ہوں اور اپنی نیند کا ایک حصہ پورا کر کے اٹھ بیٹھتا ہوں اور اس قدر تلاوت کر لیتا ہوں جو اللہ نے میرے نصیب میں لکھی ہوتی ہے۔ اس طرح میں اپنی نیند اور قیام، دونوں میں ثواب کا امیدوار رہتا ہوں (بخاری، رقم ۴۳۴۱)۔ حضرت ابو موسیٰ نے عرض کیا: یا نبی اللہ، ہمارے علاقے یمن میں جو سے مزر نامی اور شہد سے بتع نامی شرابیں بنائی جاتی ہیں، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: ہر نشہ آور شے حرام ہے (بخاری، رقم ۴۳۴۳۔ مسلم، رقم ۵۲۱۶۔ نسائی، رقم ۵۶۰۷۔ احمد، رقم

۱۹۵۹۸)۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کا قیام زبید (پرانا نام: الحسیب) کے شہر میں رہا جو اشعریوں کا مسکن اور ان کا اپنا وطن تھا، اس لیے انھوں نے اپنے فرائض منصبی کامیابی کے ساتھ سر انجام دیے۔ انھوں نے وہاں مسجد الاشاعرہ تعمیر کرائی۔

حجۃ الوداع

حضرت ابو موسیٰ اشعری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر یمن میں تھے۔ حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے تو حجون اور مسجد حرام کے مابین واقع وادی بطحا میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے دریافت فرمایا: تم نے کس نیت سے احرام باندھا ہے؟ جواب دیا: میں نے احرام باندھتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم والی نیت کی تھی۔ پوچھا: کیا تمھارے پاس ہدی (قربانی کا جانور) ہے؟ بتایا: نہیں۔ فرمایا: خوب، بیت اللہ کا طواف کرو اور سعی بین الصفا والمروہ کر کے احرام کھول دو۔ اس طرح انھوں نے حج کو فسخ کر کے عمرہ بنا لیا اور متمتع ہو گئے۔ پھر وہ اپنی قوم بنو قیس کی ایک عورت کے پاس گئے تو اس نے ان کی کنگھی کی اور سر دھویا (بخاری، رقم ۴۳۴۶۔ مسلم، رقم ۲۹۵۷۔ نسائی، رقم ۲۷۴۳۔ احمد، رقم ۱۹۵۰۵)۔

فتنۂ ارتداد و ادعاے نبوت

۱۱ھ: حضرت ابو موسیٰ اشعری حج سے فارغ ہو کر یمن واپس آئے، لیکن یہاں اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کر کے شورش پھیلا رکھی تھی۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقررہ عامل حضرت شہر بن باذام کو قتل کر کے صنعا پر قبضہ کر لیا۔ حضرت معاذ بن جبل بھاگ کر حضرت ابو موسیٰ اشعری کے پاس مارب میں چلے گئے، پھر حضرت معاذ نے سکون اور حضرت ابو موسیٰ نے سکاسک میں پناہ لی۔ اس طرح یمن پر اسود کا قبضہ ہو گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمال میں سے صرف حضرت طاہر بن ابوہالہ رہ گئے، جو عک پر متعین تھے۔ اسود عنسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں حضرت فیروز دیلمی نے قتل کیا۔ اس کی سرکوبی کی خبر لے کر قاصد مدینہ پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما چکے تھے۔

[باقی]

محمد رفیع مفتی

توبہ

(۳)

آیت ۸

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

(البقرہ ۲: ۱۶۰)

''البتہ جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو (تورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیش گوئیوں کو چھپاتے رہے تھے وہ اگر)... اس حق پوشی کے جرم سے توبہ کرلیں۔ اس توبہ کے ساتھ 'اَصْلَحُوا' کی شرط لگائی ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ توبہ اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک آدمی اس غلطی کی اصلاح نہ کرے جس کا مرتکب ہو رہا ہے۔ مزید شرط اس کے ساتھ 'بَيَّنُوْا' کی لگائی۔ یہ موقع کی مناسبت سے ہے اور سابق الذکر 'اَصْلَحُوا' کی وضاحت کر رہی ہے، یعنی آخری نبی سے متعلق تورات کے جن حقائق و بینات کو انھوں نے چھپایا ہے، اس کو ظاہر کریں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۳۸۸)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان کی توبہ اُس وقت تک معتبر نہیں ہوتی جب تک وہ اپنی اُس غلطی کی واضح طور پر اصلاح نہ کر لے

جس کا وہ مرتکب ہو رہا ہے۔

۲۔ اگر گناہ گار توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح بھی کر لیتا ہے تو پھر خدا اُس کے لیے بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

آیت ۹

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ. اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

(التوبہ ۹: ۱۰۲-۱۰۴)

”اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انھوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں ساتھ ہی دونوں کمائی ہیں۔ امید ہے کہ اللہ ان پر رحمت کی نظر کرے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔ تم ان کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو، اس سے تم ان کو پاکیزہ بناؤ گے اور ان کا تزکیہ کرو گے اور ان کے لیے دعا کرو۔ بے شک، تمھاری دعا ان کے لیے سرمایۂ تسکین ہے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا اور صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”... یہ ان لوگوں کا بیان ہے جو اگرچہ کم زوریوں میں مبتلا رہے تھے اور تبوک کے موقع پر بھی ان سے کم زوری صادر ہو گئی تھی، لیکن ایمان کی رمق ان کے اندر باقی تھی۔ جب اس سورہ نے منافقین کو اچھی طرح جھنجھوڑا اور ان کے علم میں یہ باتیں آئیں تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انھوں نے باتیں بنانے کی کوشش کے بجائے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور نہایت بے چینی کے ساتھ اپنے آپ کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈال دیا۔ روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں نے یہ تک کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ دیا کہ نہ کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے اور نہ اس وقت تک یہاں سے ٹلیں گے جب تک اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے معافی نہ ملے۔ بسا اوقات اپنے گناہوں پر بندے کی شرم ساری اور توبہ

کے لیے سچی بے قراری اللہ تعالیٰ کو اس کی نیکی سے بھی زیادہ پسند آتی ہے۔ چنانچہ ان کا اعتراف گناہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا اور... ان کو قبولیت توبہ کی امید دلا دی گئی۔

... جو چیز ان کے حق میں سفارش بنی ہے... (وہ یہ تھی) کہ یہ لوگ نفاق ہی پر نہیں پلے اور بڑھے، بلکہ بدیوں کے ساتھ انھوں نے نیکیاں بھی کمائی ہیں۔ نیکی کی راہ پر چلتے چلتے انھوں نے ٹھوکریں بھی کھائیں، لیکن اس طرح نہیں کہ گر کر پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیا ہو، بلکہ گرنے کے بعد اٹھتے اور سنبھلتے بھی رہے ہیں۔ یہی چیز ان کے لیے اعتراف گناہ اور توبہ کا باعث ہوئی ہے، اس وجہ سے یہ نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں، بلکہ اللہ کی نظر عنایت کے سزاوار ہیں۔

... (ان لوگوں سے کہا گیا) کہ اب تم اپنے عمل سے ثابت کرو کہ تم اپنی توبہ میں راسخ ہو، اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان تمھارے رویہ کو دیکھیں گے اور اسی رویہ پر تمھارے باب میں آخری فیصلہ کا انحصار ہے۔

... جن لوگوں کو معافی دے دی گئی، ان کے ساتھ ہی برکت و رحمت کے یہ دونوں دروازے بھی کھول دیے گئے۔ فرمایا کہ... ان لوگوں کے پیش کردہ صدقات قبول کر لیا کرو، اس لیے کہ اسی سے تم ان کو رذائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ کرو گے اور ان کے لیے دعا بھی کرتے رہو، اس لیے کہ تمھاری دعا ہی ہے جو ان کے لیے سرمایۂ سکینت بنے گی۔

... آپ کو یہ ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جب انھوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے تو ان کو اپنی تربیت میں از سر نو لے لو، ساتھ ہی جو چیز ان کی تربیت و اصلاح میں سب سے زیادہ موثر ہو سکتی تھی، اس کی طرف بھی رہنمائی فرما دی۔ اس آیت میں خود ان لوگوں کو توبہ اور انفاق میں سرگرم ہونے پر ابھارا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ اور ان کے صدقات قبول فرماتا ہے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، تو جو خدا کی رضا اور قرب کے طالب ہوں، انھیں چاہیے کہ وہ خدا کی پسند کے یہ کام زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے، بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۳۷)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان سے اگر غلطی ہو جائے تو اُس کے حق میں خدا کا پسندیدہ رویہ یہی ہے کہ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں بنانے اور عذر تراشنے کے بجائے صدق دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرے اور نہایت عاجزی کے ساتھ سچے دل

سے خدا سے توبہ و استغفار کرے۔

۲۔ بسا اوقات اپنے گناہوں پر بندے کی شرم ساری اور توبہ کے لیے سچی بے قراری اللہ تعالیٰ کو اس کی نیکی سے بھی زیادہ پسند آتی ہے۔

۳۔ اِسی طرح نیکی کی راہ پر چلتے چلتے انسان جب بھی ٹھوکر کھا جائے تو گرنے کے بعد اُسے لازماً اٹھنا اور سنبھلنا چاہیے اور خدا کی طرف لپک کر اُس سے مغفرت طلب کرنی چاہیے۔ ایسا شخص خدا کے نزدیک نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں، بلکہ اُس کی نظر عنایت کا سزاوار ہوتا ہے۔

۴۔ ہر گناہ گار کو اپنی توبہ کے بعد اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا لازم ہے کہ وہ اپنی توبہ میں راسخ ہے۔

۵۔ انسان کی تربیت و اصلاح میں سب سے زیادہ موثر کام انفاق میں سرگرم ہونا ہے۔ چنانچہ جو خدا کی رضا اور قرب کا طالب ہو، اُسے چاہیے کہ وہ خدا کی پسند کے کام، خاص کر انفاق زیادہ سے زیادہ کیا کرے۔

۶۔ انسان کے لیے توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے، بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔

آیت ۱۰

وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی. ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰی. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۱-۱۲۲)

’’آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بھٹک گئے۔ پھر اس کے رب نے اس کو نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کو ہدایت بخشی۔‘‘

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’(سورۂ اعراف (۷) آیت ۲۳ میں آدم کے کلمات توبہ کو اِس طرح بیان کیا ہے)

’قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ‘ (انھوں نے دعا کی کہ اے رب، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نامراد ہو کے رہ جائیں گے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم سے جو لغزش ہوئی، وہ اس پر سخت نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہ پر شرم سار ہوتا ہے، وہ اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق بخشتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد اس کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے سے قریب کر لیتا ہے۔ اسی چیز کو یہاں (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۲ میں) ’اجتباء‘ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑا ہی خوش بخت ہے وہ انسان جس کو احساس ندامت اور توفیق توبہ کے ساتھ ساتھ رب کریم کی طرف سے توبہ کے کلمات تلقین ہوں۔

...اللہ نے اس کی توبہ قبول کی اور اس پر رحم فرمایا اور اس کو ہدایت دی۔ ''ہدایت دی'' سے مراد ظاہر ہے کہ آگے کے مراحل کے لیے ہدایت دینا ہے تاکہ آدم اور ان کی ذریت شیطان کے فتنوں کا مقابلہ کر سکے۔''

(تدبر قرآن ۱۰۰/۵)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ آدمی سے اگر کوئی لغزش ہو جائے تو اُس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اس پر سخت نادم ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ جو بندہ اپنے گناہ پر شرم سار ہوتا ہے، وہ اس کو توبہ و اصلاح کی توفیق بخشتا ہے اور توبہ و اصلاح کے بعد اس کو پہلے سے بھی زیادہ اپنے سے قریب کر لیتا ہے۔

آیت ۱۱

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ. اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ. ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ. اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ. (الدخان ۴۴: ۱۲-۱۵)

''(وہ پکار اٹھیں گے کہ) ہمارے رب، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں۔ اب اِن کے لیے نصیحت کہاں! اِن کے پاس تو (ہر چیز کو) کھول کر بیان کر دینے والا رسول آگیا تھا۔ اِس پر بھی اِنھوں نے اُس سے منہ موڑا اور کہہ دیا کہ یہ تو ایک سکھایا پڑھایا باؤلا ہے۔ ہم کچھ دیر کے لیے یہ عذاب (تم سے) ہٹائے دیتے ہیں، مگر تم لوٹ کر وہی کرو گے جو تم کرتے رہے تھے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جو خواہشوں کے بندے ہوتے ہیں، ان کی توبہ عارضی ہوتی ہے، یعنی ہو سکتا ہے کہ ہم تمھاری اس درخواست پر کہ 'ہم سے عذاب ٹال دیا جائے، ہم ایمان لانے والے بن جائیں گے'، کچھ وقت کے لیے عذاب ہٹا دیں، لیکن تم پھر اسی راہ پر چلو گے جس پر عذاب سے پہلے چلتے رہے ہو۔ اپنی خواہشوں کے غلاموں کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب ان کو کوئی آزمایش پیش آجاتی ہے تو ناک رگڑ کے توبہ کرتے ہیں، لیکن جب آزمایش گزر جاتی ہے تو اس طرح چل دیتے ہیں گویا نہ کوئی بات پیش آئی، نہ انھوں نے کوئی قول و قرار کیا اور نہ آیندہ اب اس طرح کی بات پیش آئے گی۔'' (تدبر قرآن ۲۷۸/۷)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ جو شخص اپنی خواہش کا غلام ہو، اُس کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اُس پر کوئی آزمایش آتی ہے تو وہ ناک رگڑ رگڑ کر توبہ کرتا ہے۔

۲۔ لیکن آزمایش گزرنے کے بعد یہ شخص اس طرح چل دیتا ہے، گویا اُسے کبھی کوئی آزمایش پیش ہی نہیں آئی، نہ اُس نے کبھی کوئی توبہ کی اور نہ آیندہ اُسے کوئی آزمایش پیش ہی آسکتی ہے۔

آیت ۱۲

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ. (التوبہ ۹:۱۲۶)

”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں، پھر بھی نہ تو توبہ کرتے اور نہ یاد دہانی ہی حاصل کرتے ہیں۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”...اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے توفیق توبہ سے محروم ہو جانے کی طرف جو اشارہ ہے، یہ اسی کی دلیل ہے کہ یہ لوگ غور کرتے تو انھیں خود اندازہ ہو جاتا کہ ان کی بیماری اب اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے، اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا نظام اس طرح رکھا ہے کہ ہر شخص، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، سال میں ایک دو بار ضرور کسی نہ کسی ایسی آزمایش میں ڈالا جاتا ہے جو اس کو توبہ اور اصلاح پر ابھارے۔ جو صاحب توفیق ہوتے ہیں، وہ ان آزمایشوں سے سبق حاصل کرتے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن جو لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں، وہ ان آزمایشوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ چنانچہ یہ لوگ اب اسی حالت کو پہنچ چکے ہیں۔ اب کوئی ٹھوکر بھی ان کی آنکھیں کھولنے والی نہیں بنتی۔ ’ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ‘ میں ان کے دلوں کی قساوت کی طرف اشارہ ہے اور ’وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ‘ میں ان کی عقلوں کے کند ہونے کی طرف۔ اس لیے کہ ’توبہ‘ دل کا فعل ہے اور ’تذکر‘ عقل کا۔ گویا ان کے اعمال کی سیاہی نے ان کی ان دونوں ہی چیزوں کو تاریک کر دیا ہے۔“

(تدبر قرآن ۳/۶۶۵)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان اگر اپنی شخصیت اور اپنے اعمال پر غور کرے تو اُسے خود بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اب اس حد کو

پہنچ چکا ہے کہ اس کے لیے توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے، اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا نظام اس طرح کا بنا رکھا ہے کہ ہر شخص، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، سال میں ایک دو بار ضرور کسی نہ کسی ایسی آزمایش میں ڈالا جاتا ہے جو اُس کو توبہ اور اصلاح پر ابھارتی ہے۔

۳۔ صاحب توفیق انسان خدا کی جانب سے آنے والی آزمایشوں سے سبق حاصل کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

۴۔ البتہ جو شخص اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتا ہے، وہ ان آزمایشوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا، یعنی وہ نہ تو توبہ کرتا ہے اور نہ یاددہانی ہی حاصل کرتا ہے۔

آیت ۱۳

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ. اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ. (آلِ عمران ۳: ۸۹-۹۱)

”البتہ جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہو گی اور یہی لوگ اصلی گم راہ ہیں۔ بے شک، جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے۔ اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔“

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اِس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”... وہ لوگ اس عذاب سے بچ جائیں گے جو ان تنبیہات کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیں گے اور جن حق پوشیوں کے اب تک مجرم ہوئے ہیں، ان کا برملا اظہار و اعلان کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

... یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام جرائم کا ارتکاب کر کے، جن کا ذکر اوپر ہوا، ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے۔ پھر اس کفر پر ردے کے بعد ردے چڑھاتے چلے گئے۔ جب وقت آخر آیا تو زبان سے توبہ توبہ کر لی، نہ اپنے جرائم کی اصلاح کی، نہ اپنی حق پوشیوں کا پیغمبر صلی اللہ

علیہ وسلم اور اہل ایمان کے سامنے اظہار واعتراف کیا، نہ اللہ کی راہ میں انفاق اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و نصرت سے اپنے گناہ دھونے کی کوشش کی، بلکہ جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہے، اس غلط آرزو میں مر گئے کہ 'سَیُغْفَرُ لَنَا' اللہ ہماری ساری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ قرآن نے یہاں واضح فرما دیا کہ جو لوگ اس قسم کی طمع خام میں مبتلا ہیں، نہ ان کی یہ توبہ توبہ ہے، نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ کو پذیرائی بخشے گا۔

اسی طرح کا معاملہ ان لوگوں کا ہے جو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے اور اسی حالت کفر میں مر گئے۔ فرمایا کہ اگر اس طرح کے لوگ زمین برابر سونا بھی اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچانے کے لیے فدیہ میں دیں تو بھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ اسلوب بیان محض ان کی نجات کے عدم امکان کی تعبیر کے لیے اختیار کیا گیا، ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس فدیہ میں دینے کے لیے کچھ ہوگا، نہ آخرت اس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔ 'وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ' میں ان لوگوں کی اس طمع خام کی نفی ہے جو یہ اپنے بزرگ اسلاف کی شفاعت کی رکھتے تھے۔ فرمایا کہ آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔'' (تدبر قرآن ۲/۱۳۸)

اِس آیت کے الفاظ اور اِس کی تفسیر سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

۱۔ انسان، خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو، وہ اگر خدا کی تنبیہات کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیتا اور توبہ کے تقاضے پورے کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۲۔ وہ لوگ جو تمام عمر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے، پھر جب موت کا وقت آ پہنچا تو زبان سے توبہ توبہ کر لی، نہ اپنے جرائم کی اصلاح کی، نہ اپنے گناہ دھونے کی کوشش کی، بلکہ اِس آرزو میں رہے کہ اللہ ہماری ساری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ قرآن نے اِن آیات میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کی طمع خام میں مبتلا ہیں، نہ ان کی یہ توبہ توبہ ہے اور نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ کو پذیرائی بخشے گا۔

۳۔ اسی طرح ان لوگوں کا معاملہ ہے جو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے اور اسی حالت کفر میں مر گئے۔ ان کی نجات کا بھی کوئی امکان نہیں۔

۴۔ قرآن سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ قیامت کے دن اگر کوئی شخص عذاب الٰہی سے بچنے کے لیے اپنی جان کے فدیے میں خدا کو زمین برابر سونا دینا چاہے گا تو بھی وہ اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

(اِس سے اگلا آرٹیکل توبہ سے متعلق احادیث پر مشتمل ہوگا، ان شاء اللہ)۔

محمد ذکوان ندوی

کفر و شرک —— ایک کردار

ایک 'مذہبی' اجتماع میں، گفتگو کے دوران میں ہم نے یہ سوال کیا کہ اگر ایک شخص خداے واحد کو نہ مانے تو اُسے آپ کیا کہیں گے؟ لوگوں نے کہا: کافر۔ ہم نے عرض کیا: اِسی طرح اگر ایک شخص خداے واحد کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی مانے تو ایسے شخص کو آپ کیا کہیں گے؟ لوگوں نے کہا: مشرک۔

یہ ایک سادہ تقابل ہے، جس سے آپ بہ آسانی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ کفر و شرک کا ظاہرہ کیا ہے اور ''کافر'' اور ''مشرک'' کون لوگ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفر اور شرک اصلاً ایک کردار کا نام ہے، نہ کہ معروف مفہوم کے اعتبار سے، محض کسی قوم کا نام۔ مجنونانہ دنیا پرستی اور ایک خدا کے ساتھ نفس اور اُس کے علائق سے والہانہ وابستگی ہی وہ مظاہر ہیں جنھیں خدا اور رسول نے کفر اور شرک قرار دیا ہے۔

کفر اگر ناشکری اور سرکشی ہے تو شرک یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کے ساتھ دوسری چیزوں کو اپنا خدا اور اپنا اولین کنسرن (concern) بنالے۔ وہ اُن سے اُسی طرح کا والہانہ تعلق* قائم کرلے جو صرف خداوند ذوالجلال سے مطلوب ہے۔ مثلاً دنیا، حبِ دنیا، نفس پرستی، پیری و ملائی و سلطانی، دولت و ثروت، جاہ و حشمت، جلال و جمال، عہدہ و منصب، خاندان، جایداد، بینک بیلنس اور اِسی طرح 'هل من مزيد' (more and more) کے دیگر مادی اور زوال یافتہ 'مذہبی' مظاہر۔ یہ مظاہر جس قوم اور فرد میں جتنا زیادہ پائے جائیں گے، اتنا ہی زیادہ اُن کے درمیان اِس کفر اور شرک کا ظاہرہ بھی موجود ہوگا۔

موجودہ زمانے میں دوسرے 'مذہبی' گروہوں کی طرح، خود مسلمانوں کے درمیان دنیا پرستی، مادیت، ریاو

---

* البقرہ ۲: ۱۶۵۔

نفسانیت اور زوال یافتہ 'مذہبیت' کے یہ مظاہر اکثر اوقات دوسروں سے کم نظر نہیں آتے۔ دنیا اور حب دنیا کی مجنونانہ دوڑ میں وہ کسی قوم سے پیچھے نہیں۔ اُن کے درمیان بھی صبر و قناعت اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا وہی مزاج پیدا ہو گیا ہے جو دوسرے گروہوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

رمضان دنیا پرستی اور نفس کی اِس آلایش سے اپنے آپ کو پاک کرنے کا بہترین موقع ہے۔ یہ تزکیہ اور نفسانی ترغیبات سے بلند طرزِ زندگی اختیار کرنے کی ایک سالانہ درس گاہ ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اِس ماہ صیام کو اپنے لیے تقویٰ کی تربیت کا مہینا بنا سکیں۔

(ہبلی، کرناٹک، ۲۱/ مارچ ۲۰۲۳ء)

کوکب شہزاد

ایک غلط فہمی

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

ہماری علمی دنیا میں ایک چیز بہت غلط فہمی کا باعث بنتی ہے اور اس میں بہت اختلاف راے پایا جاتا ہے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو جب جنت میں رکھا اور انھیں ایک چیز کے قریب جانے سے منع کیا تو پھر کیا چیز ان کے جنت سے نکالے جانے کا باعث بنی، کس نے کس کو جنت سے نکلوایا، وہ کون سا پھل تھا جسے اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو کھانے سے منع کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کے نتیجے میں آدم اور حوا کو جنت سے نکالا گیا؟

سورۂ بقرہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو کہا کہ میں زمین میں ایک بااختیار مخلوق بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: آپ زمین میں ایسی مخلوق بنانے والے ہیں جس کو آپ اختیار دیں گے تو وہ زمین میں فساد پیدا کرے گی اور خون ریزی کرے گی۔ اگر انسان کی پیدایش کا مقصد آپ کی حمد و ثنا ہے تو وہ تو ہم کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو کہا کہ جو باتیں میں جانتا ہوں، تم اس سے ناواقف ہو۔ فرشتوں نے فرماں بردارانہ کہا کہ آپ ہمارے آقا ہیں۔ آپ جو جانتے ہیں، وہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو مٹی اور گارے سے بنا کر فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے فوراً اطاعت کرتے ہوئے سجدہ کیا، مگر جنوں نے تکبر کیا اور کہا کہ آپ نے ہمیں آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ ہمارے لیے ذلت کی بات ہے کہ ہم اپنے سے حقیر مخلوق کو سجدہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کہا کہ تو میری قربت سے دور ہو جا۔ تیرے لیے مناسب نہیں تھا کہ تو میرا حکم نہ مانتا اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا۔

کسی غلطی کی تلافی کا بہترین طریقہ قرآن مجید نے ہمیں یہی بتایا ہے کہ اگر دانستہ یا نادانستہ طور پر غلطی ہو جائے تو فوراً معافی مانگ لیں، لیکن ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے معافی تو نہ مانگی، البتہ سرکشی اور نافرمانی کرتے ہوئے کہا کہ آپ مجھے قیامت تک مہلت دیں کہ میں تیرے بنائے ہوئے انسان، جس کی وجہ سے آپ نے مجھے خود سے دور کیا اسے ہر طرح سے گم راہ کروں گا اور انھیں دائیں بائیں، آگے پیچھے سے گم راہ کر کے تیری بنائی ہوئی جہنم کو ان سے بھر دوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جا تو اپنی کوشش کر لے۔ میرے اچھے بندے کبھی تیرے بہکاوے میں نہیں آئیں گے اور ہمیشہ میرے نبیوں کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے اور میرے انعامات کے حق دار ٹھیریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا سے کہا کہ تم دونوں اس باغ میں رہو، یہ باغ کسی (tropical) جگہ پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں رہو اور جو چاہے کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا، اس درخت کا پھل نہ کھانا اور نہ چھونا، ورنہ تم اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرو گے۔

اب ہم تھوڑی سی بات اس درخت کے بارے میں کریں گے۔ بائیبل میں ہے:

”اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے، لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا، کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔“ (پیدایش ۲: ۱۵-۱۷)

اور بائبل میں دوسری جگہ ہے:

”اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت (حوا) سے کہا ”کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا؟ عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں۔ پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے، بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔

عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لیے اچھا اور آنکھوں کو خوش نما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لیے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا۔ تب دونوں کی

آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انھوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لیے لنگیاں بنائیں۔ اور انھوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا، کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اس نے کہا تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔ آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس لیے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا۔ اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑھی پر کاٹے گا۔ پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہو گی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا اس لیے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی۔ مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹکٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا۔ تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے اس لیے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے، کیونکہ تو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا۔'' (پیدایش ۳: ۱-۱۹)

یعنی بائیبل کے مطابق حضرت آدم کو نکالنے والی حوا تھی اور اس غلطی کی سزا کے طور پر اس کو بچہ جنتے وقت شدید درد ہو گی۔

قرآن مجید نے اس درخت کو، جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کو منع کیا تھا، 'شجرة الخلد' کہا ہے، یعنی ہمیشہ رہنے والا درخت، جسے کبھی زوال نہ آئے۔

عام طور پر عیسائی اس کو سیب کا درخت سمجھتے ہیں اور مسلمان اس کو گندم سمجھتے ہیں۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ سیب اور گندم کھانے سے نہ تو ہمیشہ کی زندگی مل سکتی ہے اور نہ ہی یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے آدم اور حوا اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جسارت کرتے۔ آئیں، اب ہم قرآن مجید کے حوالے سے دیکھتے

ہیں کہ وہ ’شجرۃ الخلد‘ سے کیا مراد لیتے ہیں اور جنت سے آدم کو کس نے نکلوایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ
ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ﷖
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ
السّٰجِدِيْنَ. قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ
اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ
مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ. قَالَ فَاهْبِطْ
مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا
فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ. قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ
اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ. قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ.
قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ
الْمُسْتَقِيْمَ. ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ
وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ
شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ.
قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ
لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ
اَجْمَعِيْنَ. وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا
هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ.
فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا
وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا
نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ
اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ
الْخٰلِدِيْنَ. وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ

”(تمھاری سرگذشت یہ ہے کہ) ہم نے تمھیں پیدا کیا تھا، پھر تمھاری صورتیں بنائی تھیں، پھر فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ سو ابلیس کے سوا سب سجدہ ریز ہو گئے۔ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوا۔ فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا، جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا: میں اُس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُس کو مٹی سے۔ فرمایا: اچھا تو یہاں سے اتر، اِس لیے کہ تجھے یہ حق نہیں کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے، سو نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ بولا: مجھے اُس دن تک مہلت دے، جب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ فرمایا: تجھے مہلت ہے۔ بولا: پھر اِس لیے کہ تو نے مجھے گم راہی میں ڈالا ہے، اب میں بھی اولاد آدم کے لیے ضرور تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا۔ پھر اِن کے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں، ہر طرف سے ضرور اِن پر تاخت کروں گا اور تو اِن میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا: نکل جا یہاں سے، ذلیل اور راندہ۔ (یادرکھ کہ) اِن میں سے جو تیری پیروی کریں گے، میں بھی ضرور تم سب سے اکٹھے جہنم کو بھر دوں گا۔ (ہم نے آدم سے کہا): اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس

النّٰصِحِيْنَ. فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا
الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا
يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ
وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ
تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ
لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ
اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. قَالَ اهْبِطُوْا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ.
قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ
وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ. يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا
عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ
وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ
ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ.
يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ
اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ
عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ
يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا
تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ
لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ.(الاعراف ۷: ۲۱-۲۷)

درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیرو گے۔ پھر شیطان نے اُنھیں بہکایا کہ اُن کی شرم گاہوں میں سے جو چیز اُن سے چھپائی گئی تھی، وہ اُن کے لیے کھول دے۔ اُس نے اُن سے کہا: تمھارے رب نے تمھیں اِس درخت سے صرف اِس وجہ سے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا تمھیں ہمیشہ کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔ اُس نے قسمیں کھا کر اُن سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اِس طرح فریب دے کر اُس نے دونوں کو رفتہ رفتہ مائل کر لیا۔ پھر جب اُنھوں نے درخت کا پھل چکھا تو اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھل گئیں اور وہ اُس باغ کے پتوں سے اپنے جسم ڈھانکنے لگے۔ (اُس وقت) اُن کے پروردگار نے اُنھیں پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اِس درخت سے روکا نہیں تھا اور تم سے کہا نہیں تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے؟ دونوں بول اٹھے: پروردگار، ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہماری مغفرت نہ فرمائے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور نامراد ہو جائیں گے۔ فرمایا: (یہاں سے) اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ فرمایا: تم اِسی میں جیو گے، اِسی میں مرو گے اور اِسی سے نکالے جاؤ گے۔ آدم کے بیٹو، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے جو تمھاری شرم گاہوں کو ڈھانکنے والا بھی

ہے اور تمھارے لیے زینت بھی، اور تقویٰ کا لباس، وہ اِس سے بڑھ کر ہے۔ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔ آدم کے بیٹو، ایسا ہرگز نہ ہو کہ شیطان تمھیں اُسی طرح فتنے میں مبتلا کردے، جس طرح اُس نے تمھارے ماں باپ کو اُس باغ سے نکلوا دیا، (جس میں خدا نے اُنھیں ٹھیرایا تھا)، اُن کا یہی لباس اتروا کر کہ اُن کی شرم گاہیں اُن پر کھول دے۔ (یاد رکھو)، وہ اور اُس کے ساتھی تم کو وہاں سے دیکھتے ہیں، جہاں سے تم اُنھیں نہیں دیکھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن شیطانوں کو ہم نے اُن لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔‘‘

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۵ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس غلط فہمی کو دور کیا کہ اماں حوا نے آدم کو جنت سے نکلوایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ. وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

’’فرمایا: آدم، تم اِن ہستیوں کے نام اِنھیں بتاؤ۔ پھر جب اُس نے اُن کا تعارف اُنھیں کرادیا تو فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے۔ اور (ہماری اِس اسکیم میں انسان کے امتحان کو سمجھنے کے لیے) وہ واقعہ بھی اِنھیں سناؤ، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سب سجدہ ریز ہو گئے، ابلیس کے سوا۔ اُس نے انکار کر دیا اور اکڑ بیٹھا اور اِس طرح منکروں میں شامل ہوا۔ اور ہم نے کہا:

فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ ۖ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمۡ فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ. فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ.(البقرہ ۲: ۳۵-۳۷)

اے آدم، تم اور تمھاری بیوی، دونوں اِس باغ میں رہو اور اِس میں سے جہاں سے چاہو، فراغت کے ساتھ کھاؤ۔ ہاں، البتہ تم دونوں اِس درخت کے پاس نہ جانا، ورنہ ظالم ٹھیروگے۔ پھر شیطان نے اُن کو وہاں سے پھسلا دیا اور جس حالت میں وہ تھے، اُس سے اُنھیں نکلوا کر چھوڑا۔ اور ہم نے کہا: (یہاں سے) اتر جاؤ، اب تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین پر ٹھیرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے (توبہ کے) چند الفاظ سیکھ لیے (اور اُن کے ذریعے سے توبہ کی) تو اُس پر اُس نے عنایت فرمائی اور اُس کو معاف کر دیا۔ بے شک، وہی بڑا معاف فرمانے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔‘‘

قرآن مجید کی اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ حضرت آدم کو حوا نے جنت سے نہیں نکلوایا، بلکہ شیطان نے ان دونوں کو اس پھل کو کھانے پر مجبور کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ تمھیں ہمیشہ کی زندگی ملے۔ اس طرح دونوں کو جنت سے نکلوایا اور اس طرح اس نے آدم سے اپنا انتقام لیا۔

عربی سے واقف لوگ جانتے ہیں کہ ’اَخۡرَجَ‘ فعل کا فاعل ابلیس اور ’اَخۡرَجَهُمَا‘ میں ’هُمَا‘ کی ضمیر تثنیہ ہے، یعنی دو لوگوں کے لیے ہوتی ہے، اور یہ دو سے مراد آدم اور حوا ہیں، یعنی شیطان نے ان دونوں کو بہکایا اور جنت سے نکلوانے کا باعث بنا۔

یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جس کا لوگ خواتین کے خلاف بہت ذلت آمیز استعمال کرتے ہیں۔ اس کا واضح ہونا بہت ضروری تھا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک یہ بات واضح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ مان کر غلطی شیطان نے بھی کی اور غلطی

آدم اور حوا نے بھی کی، مگر دونوں کے رویے میں یہ فرق ہے کہ شیطان نے غلطی کر کے غرور اور تکبر کا مظاہرہ کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی نہیں مانگی، لیکن آدم اور حوا غلطی کر کے فوراً نادم ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی۔ ان کے معافی کے الفاظ قرآن میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (الاعراف ۷: ۲۳)

”دونوں نے کہا کہ اے ہمارے رب، ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم خسارہ اٹھانے والے بن جائیں گے۔“

آدم اور حوا کے اس رویے سے ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ اگر ہم سے کوئی غلطی دانستہ یا غیر دانستہ ہو جائے تو ہم فوراً معافی مانگ لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور شیطان کی طرح اپنی غلطی پر مصر نہ رہیں، ورنہ شیطان کی طرح ذلیل و رسوا ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار فرمایا ہے کہ معافی مانگ کر اپنی اصلاح کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب کر رکھا ہے کہ وہ انھیں ضرور معاف کرے گا۔ جب حضرت یونس اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر چھوڑ کر چلے گئے تو اسی قانون کے تحت اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو معاف کر دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بابل اور نینوا کے علاقے میں نبی بنا کر بھیجا۔ انھوں نے اپنی قوم کو شرک کرنے سے اور برے کام کرنے سے منع کیا تو حضرت یونس نے اپنی کوشش کو کافی سمجھا اور اللہ تعالیٰ کی اجازت لیے بغیر اپنی قوم کو چھوڑ کر چلے گئے اور کسی دوسری جگہ جانے کے لیے ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی کو طوفان نے آلیا۔ کشتی میں سوار لوگوں نے کہا کہ طوفان اس لیے آیا ہے کہ کوئی اپنے آقا کو چھوڑ کر آیا ہے۔ ہم قرعہ ڈالتے ہیں، جس کا نام نکلے گا، اسے دریا میں پھینک دیں گے تاکہ کشتی بحران سے نکل آئے۔ تین دفعہ قرعہ ڈالا گیا اور تینوں دفعہ حضرت یونس کا نام نکلا۔ کشتی والوں نے حضرت یونس کو دریا میں پھینک دیا اور ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ حضرت یونس کو احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میرے گناہوں کی سزا دی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں معافی مانگی:

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۸۷)

”اے اللہ، تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔“

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا اور مچھلی کے پیٹ سے نکال کر واپس ان کے علاقے میں بھیج دیا۔ مطلب یہ ہے کہ غلطی ہو تو فوراً معافی مانگ لینی چاہیے۔

فرعون کا معاملہ بھی سب کے سامنے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بھرپور نافرمانی کرتا رہا، لیکن جب سمندر میں ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں موسیٰ کے رب پر ایمان لے آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں بار بار تمھیں جھنجھوڑ کر تمھیں تمھاری غلطیوں کا احساس دلاتا رہا اور تم نے اپنی اصلاح نہ کی، لیکن تم اب اپنی موت دیکھ کر ایمان لانے کا اقرار کر رہے ہو۔ موت دیکھ کر ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا۔ توبہ کے قانون پر ان شاء اللہ ہم کسی اگلے مضمون میں لکھیں گے۔

اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد کہ حضرت آدم کو اماں حوا نے جنت سے نہیں نکلوایا، بلکہ ان دونوں کو شیطان نے بہکایا تھا اور ورغلا کر جنت سے نکلوانے کا باعث بنا۔ اور جو انسان غلطی کرنے کے فوراً بعد توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ اسے معاف کر دے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ 'شجرۃ الخلد' سے کیا مراد ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا. وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى. فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى. اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى. وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى. فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى. فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى. ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى. قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًاۢ بَعْضُكُمْ

"(اس لیے کہ تم جس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، وہ ایک بھاری ذمہ داری ہے)۔ ہم نے اِس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا تھا اور ہم نے اُس میں ارادے کی پختگی نہیں پائی تھی۔ یاد کرو، جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو وہ سجدہ ریز ہو گئے، مگر ابلیس نہیں مانا، اُس نے انکار کر دیا۔ اِس پر ہم نے کہا کہ اے آدم، یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے تو ایسا نہ ہو کہ یہ تم دونوں کو اِس باغ سے نکلوا دے، پھر تم محروم ہو کر رہ جاؤ۔ یہاں تو تمھیں یہ آسایش ہے کہ نہ اِس میں بھوکے رہتے ہو نہ لباس کی ضرورت ہوتی ہے، نہ تم کو اِس میں پیاس ستاتی ہے نہ دھوپ لگتی ہے۔

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ
هُدًى ۙ۵ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا
يَشْقٰى. وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ
مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَعْمٰى. قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ
كُنْتُ بَصِيْرًا. قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا
فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى. وَكَذٰلِكَ
نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى.

(طٰہٰ ۲۰: ۱۱۵-۱۲۷)

لیکن شیطان نے اُس کو ورغلایا۔ اُس نے کہا: آدم، میں تم کو وہ درخت بتاؤں جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے اور اُس بادشاہی کا پتا دوں جس پر کبھی زوال نہ آئے گا؟ سو (اُس کی ترغیب سے آدم و حوا)، دونوں نے اُس درخت کا پھل کھا لیا تو اُن کی پردے کی چیزیں اُن پر ظاہر ہو گئیں اور (اُن کو چھپانے کے لیے) وہ دونوں اپنے اوپر اُس باغ کے پتے گانٹھنے لگے۔ اِس طرح آدم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اُس کے پروردگار نے اُس کو برگزیدہ کیا۔ سو اپنی عنایت سے اُس کی توبہ قبول فرمائی اور اُسے راستہ دکھا دیا۔ فرمایا: تم دونوں فریق یہاں سے اتر جاؤ، اکٹھے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ پھر میری طرف سے اگر کوئی ہدایت تمھارے پاس آئے تو اُس کی پیروی کرو، اِس لیے کہ جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، وہ نہ گم راہ ہو گا نہ محروم رہے گا۔ اور جو میری یاددہانی سے منہ موڑے گا تو اُس کے لیے تنگی کی زندگی ہے اور قیامت کے دن ہم اُس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: پروردگار، تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے، میں تو آنکھوں والا تھا۔ ارشاد ہو گا: ہماری آیتیں تمھارے پاس آئی تھیں تو تم نے اِسی طرح اُنھیں نظر انداز کر دیا تھا۔ آج تمھیں بھی اُسی طرح نظر انداز کر دیا جائے گا۔ ہم اُن کو جو حد سے گزر گئے اور اپنے پروردگار کی

آیتوں پر ایمان نہیں لائے، اِسی طرح بدلہ دیں
گے۔ اور آخرت کا عذاب تو زیادہ سخت اور زیادہ
دیرپا ہے۔“

ان آیات کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے استاذ محترم اپنی تفسیر ”البیان“ میں لکھتے ہیں:

”یہ الفاظ بتارہے ہیں کہ لفظ ’شَجَرَة‘ یہاں مجازی مفہوم میں ہے اوراِس سے مراد وہی شجرۂ تناسل ہے، جس کا پھل کھانے ہی سے انسان اِس دنیا میں اپنے آپ کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ چنانچہ ابلیس نے یہ لالچ دے کر آدم و حوا کو اُس درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی کہ حیات جاوداں اور ابدی بادشاہی کا راز اِسی درخت کے پھل میں ہے، جس سے تمھیں محروم کر دیا گیا ہے۔ اِس کا پھل کھاؤ گے تو باقی رہو گے، ورنہ جلد یا بدیر موت سے دوچار ہو جاؤ گے۔ شیطان کی یہ بات، اگر غور کیجیے تو ایسی غلط بھی نہیں تھی، اِس لیے کہ یہ اِسی درخت کا پھل ہے، جس کے کھانے سے انسان کی زندگی کا تسلسل دنیا میں قائم ہے۔“(۳/۲۶۵)

ان دلائل سے واضح ہے کہ حضرت حوا نے حضرت آدم کو پھل کھانے کے لیے مجبور نہیں کیا، بلکہ شیطان نے مجبور کیا اور دوسری بات یہ کہ اس پھل سے مراد نہ تو سیب کا پھل ہے اور نہ گندم، بلکہ میاں بیوی کا ازدواجی تعلق تھا، جس سے نسل انسانی آگے بڑھتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ’شجرۃ الخلد‘ سے بھی تلمیح کیا ہے، کیونکہ اسی سے انسان کا خاندان اور اس کا نام آگے بڑھتا ہے۔

معاذ بن نور

علم اور اس کے ذرائع؟

[جناب جاوید احمد غامدی کی ویڈیوز کی ٹرانسکرپشن پر مبنی سوال و جواب]

سوال: علم کیا چیز ہے؟ اس کے ذرائع کیا ہیں؟

جواب: انسان کے ظاہری اور باطنی حواس کے حاصلات اور عقلی استنباط کے نتائج کا نام علم ہے، یعنی میرے پاس ہے کیا؟ مجھے کچھ حواس دیے گئے ہیں، جو خارج کی دنیا سے میرا تعلق قائم کرتے ہیں اور کچھ حواس دیے گئے ہیں، جو اندر کی دنیا سے میرا تعلق قائم کرتے ہیں، یعنی یہ تو بالکل ایک بدیہی چیز ہے۔ ان (ظاہری اور باطنی حواس) کے حاصلات کو علم کہا جاتا ہے، یعنی میں جب آنکھوں، کانوں اور چھونے سے اس دنیا کے ساتھ متعلق ہوتا ہوں تو میرے حواس اشیا سے مجھے متعلق کرتے ہیں۔ میرے باطن میں بھی کچھ حواس ہیں وہاں بھی علم کے کچھ ذخائر پڑے ہوئے ہیں، کچھ چیزیں مجھے دے کر بھیجا گیا ہے، کچھ چیزیں میرے وجود کا لازمہ بن گئی ہیں (اور) جو قالب مجھے دیا گیا ہے، اس کے ساتھ لاحق ہوتی ہیں، ان سب کو میرے باطنی حواس اپنے ادراک کی گرفت میں لے آتے ہیں۔

ان (ظاہری و باطنی حواس کے) حاصلات کا باہمی تعلق جب پیدا ہوتا ہے تو علم وجود میں آجاتا ہے۔ اب میرے پاس وہ بنیاد میسر آجاتی ہے، چونکہ مجھے عقل دی گئی ہے، تو میں اس (حسی) علم سے (عقلی) استنباط کروں گا اور اس استنباط سے پھر کچھ نتائج نکلیں گے۔ تو یہ دونوں چیزیں ہیں جن کو آپ مجموعی حیثیت سے علم کہتے ہیں۔

(اوپر کی) اس (گفتگو) میں میں نے دوسرے سوال کا جواب بھی آپ کو دے دیا ہے کہ علم کے ذرائع کیا ہیں؟ یہی ذرائع ہیں، ان کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا ذریعۂ علم نہیں ہے، یعنی یا وہ حواس مجھ تک کچھ معلومات پہنچاتے ہیں جن کو ظاہر میں میں بھی دیکھتا ہوں اور آپ بھی دیکھتے ہیں۔ ان حواس کے حاصلات کو ہم تجربہ و مشاہدہ کہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں سائنسی علم (بھی) اپنا اصل انحصار ان (ظاہری حواس) ہی پر رکھتا ہے، (تاہم) یوں نہیں ہے کہ سائنسی علم محض ان پر مبنی ہوتا ہے، بلکہ اس کا اصل انحصار ان (ظاہری حواس) ہی پر ہے۔

ہمارے باطن میں جو حواس ہیں، وہ بھی ظاہر بات ہے کہ ہمارے اخلاقی وجود کا ہمیں شعور دیتے ہیں، وہ ہماری جمالیاتی حس کا ہمیں شعور دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ خود ہم اپنے باطن کے اندر جو کچھ موجود ہے، اس کا ادراک کرتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر ہمارا وجدان ایک حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ وہی اس اضطراری علم کو دنیا سے متعلق کرنے کا باعث بنتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دے کر دنیا میں بھیجا ہے۔ تو یہ ہمارا ظاہر و باطن ہے جس میں حواس دیے گئے ہیں اندر بھی اور باہر بھی۔ یعنی حاسۂ اخلاقی ہے تو وہ بھی من جملہ حواس (ہی) ہے۔ اسی طرح باہر کے حواس سے تو ہر آدمی واقف ہے۔

یہ سب کچھ جب میسر آجاتا ہے تو عقل استنباط کرنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ اس (حسی علم) سے کوئی اصل وجود میں آگئی ہے تو اس کی فرع نکالنا شروع کر دیتی ہے، کوئی فرع وجود میں آگئی ہے تو اس کی اصل کو دریافت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جیسے افلاطون نے اس کائنات کے اجزا میں جن چیزوں کا ظہور ہوا ہے، اس سے ایک کلی دریافت کی اور عالم مثال کا تخیل پیدا کر لیا۔ تو ظاہر ہے، یہ کام عقل کر رہی ہے، جو استنباط کا طریقہ ہے۔

یہ استنباط سائنسی علوم میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ آپ کے سامنے آپ کے حواس نے کچھ چیزیں رکھ دی ہیں جو آپ نے اس پوری کائنات میں دیکھ لی ہیں۔ (مثلاً) آپ نے کچھ انسان دیکھ لیے، کچھ فوسلز دیکھ لیے اور کچھ بستیاں دریافت کر لیں اور انسان کے اپنے وجود کا تجزیہ کر لیا۔ یہ سب چیزیں جب ہو گئیں تو ان سے استنباط کر کے آپ کہتے ہیں کہ یہ ہوا ہوگا، جس سے نظریات بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کا معاملہ آپ جانتے ہیں خود ہماری کائنات کے بارے میں ہوا ہے، یعنی ہم بگ بینگ کے تصور تک کیسے پہنچے ہیں، جب کہ اس کو ہم دیکھتے نہیں ہیں، وہ ہمارے مشاہدے کی چیز نہیں ہے۔ ہم نے کائنات کو وسیع ہوتے دیکھا ہے اور آج بھی دیکھ سکتے ہیں اور اس (توسیع) سے (بگ بینگ) کا استنباط کرتے ہیں۔

لہٰذا ہمارا علم استنباطی بھی ہوتا ہے اور (علم) براہ راست ہمارے ظاہری اور باطنی حواس کے حاصلات پر مبنی

بھی ہوتا ہے۔ اصل علم وہی ہے جو (ظاہری و باطنی حواس سے) پیدا ہوتا ہے اور جو ہمیں دیا گیا ہے، وہ وہی ہمارے (ان حواس کے) حاصلات ہیں۔ استنباطی علم بہر حال پھر اس کے بعد کا عمل ہے اور میں نے یہ عرض کیا کہ استنباطی علم بھی کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔ وہ بھی ہمارے وجود اور تصورات کا احاطہ کرتا ہے اور ہمارے تمام علوم میں آگے بڑھنے کی بنیاد وہی فراہم کرتا ہے، اس لیے اس (استنباطی علم) سے نظریات بنتے ہیں اور جو کچھ بھی ہم آگے بڑھ کر دریافت کرتے ہیں، اس کے لیے گویا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔[1]

علم کیا ہے؟ کیا لفظ اور علمی تصورات لازم و ملزوم ہیں؟

سوال: عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ علم کا آغاز لفظ سے ہوتا ہے۔ (علم اور لفظ کے) اس فرق کو کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: لفظ ابلاغ کا ذریعہ بنتا ہے۔ پیدایش کے بعد ہماری تربیت اس طرح ہو جاتی ہے کہ جیسے جیسے ہمارا شعور بیدار ہوتا ہے، ہم زبان سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لیے (انسانی ذہن میں اشیا سے متعلق حواس اور عقلی استنباط پر مبنی) جتنے تصورات بھی بنتے ہیں، وہ لفظ (اور زبان) سے مجرد ہو کر نہیں بن سکتے، بلکہ لفظوں کے ساتھ ہی ہمارے ہاں موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات صحیح ہے کہ خواہ ہمارا ظاہر ہو یا باطن، ہمارے حواس جیسے ہی (خارج میں) اشیا سے اور باطن میں تصورات اور حسیات سے متعلق ہوتے ہیں تو لفظ کے سانچے میں ڈھلے ہوئے گویا چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ (لفظ اور تصورات کے اس تعلق کو قائم رکھنا) ہماری مجبوری ہے، کیونکہ ہم اس (تعلق) کے بغیر کسی چیز کو تصور نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی جب کسی نادیدہ عالم کا تعارف کرانا چاہتے ہیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی کوئی تصویر ہمارے ذہن میں خود بخود آ جائے، اللہ تعالیٰ اس تصور کو لفظوں ہی کا پیرہن پہناتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ میں نے (انسانوں کے لیے ان تصورات کے بیان کے لیے) متشابہات کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔[2]

۱- https://youtu.be/4tMwGmCP9uk?si=Vai8SNKNHvN2A9IZ
۲- https://youtu.be/4tMwGmCP9uk?si=Vai8SNKNHvN2A9IZ

علم کیا ہے؟ علم کے ذرائع کیا ہیں؟

سوال: کیا انبیا کے ہاں وحی اور دنیاوی علم، دونوں کا حصول حواس ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے؟ اگر ان دونوں علوم کے مابین یہ ایک قدر مشترک ہے تو پھر وحی اور دنیاوی علم میں کس لحاظ سے فرق وارد ہوتا ہے؟ کیا وحی کے مطالبات کو ماننے کے لیے براہ راست وحی کے تجربے و مشاہدے کا مطالبہ کرنا معقول بات ہے؟

جواب: جیسے میں نے عرض کیا کہ (انسانوں کے ہاں) علم کی بنیاد ہمارے حواس کے حاصلات ہی سے پڑتی ہے، جس کے بعد استنباط کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ پیغمبر (بھی چونکہ حواس رکھنے والے انسان ہی ہوتے ہیں، اس لیے وحی ان) کے (ہاں بھی) حواس ہی کا حاصل ہوتی ہے۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات سنی، ایسے ہی جیسے ہم آوازیں سنتے ہیں۔ یہ (ان کے حواس کے لیے) اتنی حقیقی ہوتی ہے کہ اس کی تصویر دیکھنی ہو تو قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ دیکھ لیجیے۔ یعنی رات کی تاریکی میں سفر اور سردی میں ہیں، ایک جگہ آگ نظر آتی ہے تو اس سے استنباط کرتے ہیں کہ یہاں کوئی قافلہ ہو گا جس سے راستہ پوچھ سکوں گا یا پھر کچھ انگارے لا کر تاپ کر سردی کا مقابلہ ہی کیا جا سکے گا۔ یہاں کیا ہوا؟ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کو) پہلے حواس کا مشاہدہ ہوا، اس کے بعد اللہ کی طرف سے آواز آتی ہے تو اس آواز کو بھی کون سنتا ہے؟ پیغمبر کے حواس ہی سنتے ہیں۔

یعنی جب میں آپ کی بات سنتا ہوں تو الفاظ کا جامہ پہن کر (آپ کا) علم (مجھے) منتقل ہوتا ہے۔ یہ جس کو وحی کہا جاتا ہے، اس میں بھی یہی ہوتا ہے

یعنی (خدا کی طرف سے وحی کا) علم پیغمبر کو منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے کہ وحی اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے ساتھ کلام کی ایک صورت ہے۔

البتہ وحی کو اللہ تعالیٰ نے محدود رکھا ہے، اس لیے پیغمبر کی گواہی اور اس کی شہادت ہی سے یہ کلام ہم تک پہنچتا ہے۔ یعنی پیغمبر کو جو کچھ (وحی کی صورت میں اس کے حواس کے ذریعے سے) حاصل ہوتا ہے، وہ اس کو (دوسروں کے سامنے) بیان فرماتے ہیں۔ اسی طرح بیان فرماتے ہیں، جس طرح ایک سائنس دان اپنے (حواس کے) حاصلات کو بیان کرتا ہے، یعنی سائنس دان کو اپنے تجربات و مشاہدات سے ایک چیز ملتی ہے تو وہ آپ تک پہنچاتا ہے اور پیغمبر کو ملتی ہے تو وہ بھی پہنچاتا ہے۔

چنانچہ ہر انسان کو اس (وحی کے علم) کا تجربہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر آپ پیغمبر سے مطالبہ کریں گے کہ آپ پر وحی نازل ہوئی، اس لیے ہم پر بھی نازل ہو جائے تو یہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اختصاص کا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی (فطری ہدایت ہر انسان کو دے دینے کے بعد پھر) یوں نہیں کیا کہ اپنی (آسمانی) ہدایت پہنچانے کے لیے وہ ہر ایک پر وحی بھیج دے، بلکہ اس کے لیے طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بندوں میں سے کچھ کا انتخاب کرتا ہے، یعنی پیغمبروں کے معاملے میں اختصاص ہوتا ہے اور اکتساب کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے وحی کا یہ تجربہ مجھے اور آپ کو کرایا نہیں جا سکتا۔

لہٰذا ہم پھر (علم ہدایت کے حصول کے لیے) اس چیز کو علمی و عقلی طریقہ سے تجزیہ سے گزارتے ہیں جو پیغمبر پر نازل ہوتی ہے، یعنی اب ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کی جانے والی وحی قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے اور جب ہم اس قرآن کو دیکھتے ہیں تو حواس ہی کے ذریعے سے اس میں موجود ہدایت کو اخذ کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے اپنے حقائق کو جب پیش کرتا ہے تو استدلال کرتا ہے، جس کے مقدمات وہی ہیں جو ہمارے حواس کے حاصلات ہو سکتے ہیں۔ ان سے استنباط کے طریقے بھی وہی ہیں جو طریقے ہم عقلی استنباط کے لیے دنیا کے دوسرے بہت سے علوم میں اختیار کرتے ہیں۔

تاہم اگر کوئی شخص اس بات پر اصرار کرے کہ مجھے بھی وحی کا تجربہ ہو گا، تب ہی میں مانوں گا تو (چونکہ حقائق کو ماننے کے لیے یہ ایک غیر معقول مطالبہ ہے، اس لیے) یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔[۳]

۳- https://youtu.be/4tMwGmCP9uk?si=xvNE0w3NvdT2hLZK

شاہد رضا

سچا دین

[جناب جاوید احمد غامدی کی تحریروں، آڈیوز اور
ویڈیوز سے اخذ و استفادہ پر مبنی مختصر سوال و جواب]

سوال: کیا صرف اسلام ہی سچا دین ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دین بھیجا تھا، اس لیے اس کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب ہے ہی نہیں۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب پیغمبر ایک ہی دین لے کر آئے ہیں۔ اس دین کا نام اللہ نے کسی شخص، علاقے یا مدرسے کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ اس کا نام 'اسلام' رکھا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں اعلان کیا ہے کہ:

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ. (۳:۱۹) "بے شک، اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔"

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، اللہ کا ایک ہی دین رہا ہے اور اس کا نام 'اسلام' ہے۔ 'اسلام' کا مطلب ہے: اپنے آپ کو سرنڈر (surrender) کر دینا، حوالے کر دینا، سپرد کر دینا اور خدا کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دینا۔ یہ لفظ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت بولا تھا، جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم حکم کی پیروی میں ایک غیر معمولی اقدام کیا تو جواب میں کہا:

اِذۡ قَالَ لَہٗ رَبُّہٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ "(وہی ابراہیم کہ) جب اُس کے پروردگار نے

الْعٰلَمِيْنَ.(البقرہ۲:۱۳۱)

اُسے حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالے کر دو، اُس نے فوراً کہا: میں نے اپنے آپ کو پروردگار عالم کے حوالے کر دیا۔‘‘

یعنی میں نے اپنے آپ کو جہانوں کے پروردگار کے سپرد کر دیا ہے۔ ’اسلام‘ اللہ تعالیٰ کا رکھا ہوا نام ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے، اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت بھی دی ہے، اس کے لیے ’اسلام‘ ہی کا لفظ اختیار کیا ہے اور اس کے ماننے والوں کو ’مسلمان‘ کہا ہے۔

چنانچہ قریش مکہ کو بھی توجہ دلائی گئی کہ تم نے یہ کس قسم کے نام رکھ لیے ہیں اور کن فرقوں میں بٹ گئے ہو، تمھارے باپ ابراہیم نے تو تمھارا نام ’مسلمان‘ رکھا تھا:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ.(الحج۲۲:۷۸)

’’اُسی نے تمھارا نام مسلم رکھا تھا۔‘‘

لہٰذا ہماری مذہبی شناخت مسلمان ہے۔ یہود اور مسیحی بھی اسلام ہی کا ایک فرقہ ہیں۔ تمام الہامی کتابیں —— تورات، انجیل اور زبور —— اسلام ہی کی کتابیں ہیں۔ انبیا علیہم السلام کے صحائف اسلام ہی کے صحائف ہیں۔ قرآن مجید نے سورۂ شوریٰ میں وضاحت کی ہے کہ:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ.(۴۲:۱۳)

’’اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔‘‘

اللہ تعالیٰ کا دین ایک ہی دین ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا مذہب اور دین دنیا میں ہے ہی نہیں۔ یہ سب ہمارے مسلمان بھائی ہیں، جو اپنے نام بھی نئے رکھ بیٹھے ہیں اور اپنے دین کو بھی فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ان کو یاد دلائیے کہ ان کا دین اسلام ہے، اس لیے کہ دنیا کے اندر کوئی دو دین نہیں ہیں۔ انسانوں نے جو چیزیں پیدا کی ہیں، وہ فلسفہ، تصوف اور مذہب میں لوگوں کی ایجاد کی ہوئی طرح طرح کی بدعتیں ہیں۔ اللہ نے کبھی دو دین

بھیجے ہی نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی دین بھیجا ہے۔[1]

حج و عمرہ کا مقصد

حج و عمرہ کا مقصد وہی ہے جو اِن کی حقیقت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف، اُس کی توحید کا اقرار اور اِس بات کی یاد دہانی کہ اسلام قبول کر کے ہم اپنے آپ کو پروردگار کی نذر کر چکے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی معرفت اور دل و دماغ میں جن کے رسوخ کو قرآن نے مقامات حج کے منافع سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ حج کی جو آیت ابتدا میں نقل ہوئی ہے، اُس میں حج کے مناسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: 'لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهِمْ' (تاکہ وہ اپنے لیے منفعت کی جگھوں پر حاضر ہوں)۔ یہ مقصد ذکر کے اُن الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوتا ہے جو اِس عبادت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِسی مقصد کو نمایاں رکھنے اور ذہنوں میں پوری طرح راسخ کر دینے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ احرام باندھ لینے کے بعد یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر مسلسل جاری رہتے ہیں:

لَبَّيْكَ، اللّٰهمَّ لَبَّيْكَ؛ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ، لَبَّيْكَ؛ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَاشَرِيْكَ لَكَ.

''میں حاضر ہوں، اے اللہ، حاضر ہوں؛ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں؛ میں حاضر ہوں، حمد تیرے لیے ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیرے ہی لیے ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں۔''

(جاوید احمد غامدی، میزان ۳۸۴)

۱- https://ghamidi.com/videos/can-we-claim-that-islam-is-the-only-true-religion-3863

شخصیات

محمد بلال

حیات امین احسن

(۹)

باب ۹

سابقین جماعت کی مجلس مشاورت

جماعت اسلامی کے تاریخی ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان میں ۷۰ ارکان جماعت سے الگ ہو گئے تھے۔ امین احسن کے احباب اور جماعتی دور کے رفقا نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان ارکان کو اکٹھا کریں اور ایک نئی جماعت بنائیں۔ امین احسن کا خیال تھا کہ چونکہ یہ سب افراد کسی ایک نکتے پر متفق ہو کر جماعت سے الگ نہیں ہوئے، اس لیے ان کو مجتمع کرنا، مینڈکوں کی پنسیری باندھنے کے مترادف ہو گا اور وہ کوئی کام نہیں کر پائیں گے۔ تاہم امین احسن نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ایسے افراد کے ساتھ فرداً فرداً رابطہ کیا جائے، اگر ان کے اندر ذہنی ہم آہنگی اور کسی پروگرام پر اتفاق پایا جائے تو نظم قائم کرنے کا اقدام کیا جائے۔ چنانچہ مولانا عبد الغفار حسن اور شیخ سلطان احمد صاحب نے ملک کا دورہ کر کے ان ارکان کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور اسی نتیجے پر پہنچے کہ سب کے ہاں جماعت سے الگ ہونے کے اسباب مختلف ہیں۔ اور ہر شخص جماعت میں خرابی کی نشان دہی اپنے تجربے کی روشنی میں ذاتی رائے کے مطابق کر رہا ہے۔ یہ سب لوگ کسی متعین ہدف پر متفق نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر ان کے مابین جماعتی نظم قائم کرنا لاحاصل ہو گا۔ البتہ جتنے لوگ ہم خیال نظر آتے ہیں، ان کا ایک اجتماع منعقد کر کے مجلس مشاورت قائم کر دی جائے۔ اس مجلس کا ایک اجتماع ۶-۹/ ستمبر ۱۹۶۷ء

کو رحیم یار خان میں ہوا، جس میں آیندہ کام کے لیے ایک قرارداد منظور کی گئی اور ایک ہیئت اجتماعی کی راہ ہموار کرنے کے لیے ایک مجلس مشاورت کا تقرر ہوا۔ اس مجلس کے حسب ذیل سات ارکان تھے:

مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا عبدالغفار حسن، مولانا عبدالحق جامعی، سردار محمد اجمل خان لغاری، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر اسرار احمد اور شیخ سلطان احمد (معتمد)۔

مگر اس کے باوجود یہ تنظیم قائم نہ ہو سکی۔ البتہ مجلس کے فیصلوں کی روشنی میں ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے گھر پر ہفتہ وار درس قرآن شروع کیا، جس میں امین احسن نے قرآن مجید کی آخری سورتوں کا درس دیا، مگر بعد میں امین احسن کو ڈاکٹر صاحب کے فکر سے اختلاف ہو گیا اور ان کے بعض رویوں سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ اس ضمن میں امین احسن کے چند مکاتیب بھی درج کیے جاتے ہیں، جن سے ان کی شدت غم کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

ڈاکٹر عبداللطیف خان کے نام لاہور سے ۷ ؍ ستمبر ۱۹۷۲ء کو لکھا:

''بڑے غم کے ساتھ آپ کو اس سانحے کی اطلاع دیتا ہوں کہ میں نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بعض خلافِ شریعت اقدامات کی وجہ سے ان سے اور رسالہ میثاق سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہے۔ حادثے کی تفصیلات سے آپ کو دکھ ہو گا، اس وجہ سے ان کے ذکر سے گریز کرتا ہوں۔ میں نے بھی اور مجھ سے بہتر دوسرے احباب نے بھی ڈاکٹر صاحب کو بہت سمجھانے کی کوشش کی، لیکن افسوس ہے کہ کامیابی نہیں ہوئی۔ قدرتی طور پر اس سانحہ کا میری صحت پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ دعا فرمایئے کہ یہ زندگی کا آخری سانحہ ہو۔ اب اس قسم کے سانحہ کے برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی ہے۔

میرے درس کا سلسلہ الحمد اللہ جاری ہے اور اب میں تفسیر کے لکھنے کا کام بھی شروع کر رہا ہوں۔ دعا فرمایئے کہ آخر دم تک یہ کام جاری رہے آپ کے گرامی نامہ کا تشویش کے ساتھ انتظار رہے گا۔ براہ کرم جواب سے جلد مطمئن فرمایئے۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۶۷)

حکیم شیخ سلطان احمد کے نام لاہور سے ۷ ؍ ستمبر ۱۹۷۲ء کو لکھا:

''اگرچہ معاملہ زیر بحث میں اب مجھے کسی خیر کی امید نہیں ہے، لیکن آپ اگر کسی خیر کی امید دیکھتے ہیں تو کوشش کر دیکھئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اب بالکل مایوس ہو چکا ہوں اس وجہ سے میں نے کہلا دیا ہے کہ پرچے کے سرورق سے میرا نام نکال دیا جائے اور تفسیر کی اشاعت پرچے میں بند کر دی جائے (پرچہ سے مراد ماہنامہ میثاق ہے جو ڈاکٹر صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔ مدیر) میرا خیال ہے کہ میری طرف سے

اظہارِ براءت کے لیے یہ چیز کافی ہو گی۔ پبلک میں کوئی اعلان کر کے میں اپنی رسوائی کی مزید تشہیر نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ ''چٹان'' وغیرہ مجھ سے انٹرویو کے خواہش مند تھے، لیکن صحت کی خرابی کا عذر کر کے میں نے بات ٹال دی ہے۔... میں اب قطعی معلومات کی بنا پر اس نتیجہ تک پہنچ چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو روپے کی ضرورت تھی وہ ان کو مل گیا ہے۔ آپ لوگوں کی اب ان کو مطلق ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ خاموشی سے اس فتنہ سے الگ ہو جائیے۔ ان کو کسی پہلو سے منہ لگانا بھی آپ لوگوں کے شایانِ شان نہیں ہے بس جو حادثہ پیش آنا تھا وہ پیش آ چکا۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' (سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۶۷-۶۸)

مدیر ''تدبر'' خالد مسعود صاحب کے نام رحمان آباد سے ۲۰/ جولائی ۱۹۷۷ء کو لکھا:

''آج یہ خط آپ کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ میں ایک پمفلٹ ''اسرار نامہ'' کے عنوان سے لکھنا چاہتا ہوں تا کہ اسرار صاحب نے میرے وصل و فصل سے متعلق جو یوسف زلیخا لکھی ہے اس کا جامع جواب ہو جائے اور روز روز کے سوال و جواب سے میری جان چھوٹے۔ اس میں چار پانچ باب ہوں گے:

پہلے باب میں یہ بتاؤں گا کہ میں نے کن توقعات پر اور کس طرح ڈاکٹر صاحب کو اپنے قریب کیا تھا۔

دوسرے میں یہ بتاؤں گا کہ میری طویل علالت کے زمانے میں (یہ اشارہ ۱۹۷۲ء میں نسیان کے حملہ کی طرف ہے۔ مدیر) ڈاکٹر صاحب نے یہ فرض کر کے کہ اب میرا آخری وقت ہے، مجھے ہر پہلو سے بالکل بے دست و پا اور مفلوج کر دینے کی کیا کیا سازشیں کیں اور ان کے کیا اثرات باہمی تعلقات پر پڑے۔

تیسرے میں یہ بتاؤں گا کہ انھوں نے ان مقاصد کے لیے، جن سے میں شدید بیزار تھا، میرے احتجاج کے علی الرغم، کن کن طریقوں سے میرے نام کو استعمال کیا اور لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں سب میری سرپرستی میں، میری ہدایات کے تحت کر رہے ہیں۔

چوتھے میں ان کی دعاوی اور شطحات کا جائزہ لوں گا اور یہ بتاؤں گا کہ ان کے اصلی افق وہ چار نہیں ہیں جو انھوں نے بتائے ہیں، بلکہ ان کا افقِ اعلیٰ قادیان اور ربوہ ہے اور ایک نئی قادیانیت کے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں علماء کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ اس فتنہ سے آگاہ رہیں اور اس کو سر نہ اٹھانے دیں۔

پانچویں میں یہ بتاؤں گا کہ اس پورے دورِ وصل میں میں نے ان کو وصل کے کیا کیا آداب بتائے اور سکھائے اور انھوں نے کیا کیا کج ادائیاں کیں جو بالآخر فصل پر منتہیٰ ہوئیں۔

اس خاکے پر آپ اور دوسرے رفقاء غور کر لیں اور اپنے مشورے سے آگاہ کریں۔ اس میں ''میثاق'' وغیرہ سے حوالے نقل کرنے ہوں گے جو آپ کو جمع کرنے پڑیں گے اور یہ کام آپ شروع کر دیں۔

یہ خط رازدارانہ نہیں ہے۔آپ مناسب سمجھیں تو پمفلٹ کے عنوانات کا اعلان بھی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا معافی نامہ ایک تمہید کے ساتھ ''شمس الاسلام'' کو دے دیں۔

(اس موضوع پر پے در پے خطوط موصول ہونے پر یہ اندازہ ہوا کہ میثاق میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے نکلنے والے بعض مضامین نے مولاناؒ کو بے حد پریشان کیا ہے اور وہ شاید تفسیر کے کام سے ہٹ کر ایک بے مصرف کام میں الجھنے والے ہیں۔ چنانچہ راقم نے مشورہ دیا کہ مولانا اپنے کام ہی سے سروکار رکھیں اور اسرار نامہ کے لیے ہرگز فکر مند نہ ہوں۔ضرورت ہوئی تو یہ پمفلٹ لکھنے کا کام کر لیا جائے گا۔مدیر)''

(سہ ماہی تدبر، جولائی ۱۹۹۸ء، ۷۰-۷۱)

Monthly
ISHRAQ
Lahore

June 2024
Vol.36 No.6
Regd. No. CPL-183

Publisher: javed Ahmad Ghamidi. Printers: Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore

ماہنامہ ’’اشراق‘‘ کی اشاعت کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ ’’اشراق‘‘ کی تاریخ بہت درخشاں ہے۔ اِس نے دین کی علمی خدمت کے کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اِس نے دین کی اشاعت وفروغ میں بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے قارئین کے شعوری افق میں نئے در وا کیے ہیں۔ اِس نے دین کے ساتھ وابستگی کو رواجی سے اٹھا کر شعوری اور قلبی بنایا ہے۔ شکست خوردگی کے آزار کا درماں بنا ہے۔ دین سے دوری کے اسباب کا سد باب کیا ہے۔ دین پر اعتماد کو بحال کیا ہے۔ غرض یہ کہ دین کی ہمہ جہت خدمت اِس کا منشور ہے۔

قارئین ہر جریدے کی زندگی کا سبب ہیں۔ جو لوگ ’’اشراق‘‘ کے ساتھ وابستہ ہیں، وہ اِس کے دست و بازو بھی ہیں۔ ’’اشراق‘‘ کی انتظامیہ توقع کرتی ہے کہ اِس کے قارئین اِس کی دعوت کے نقیب بھی بنیں۔

البیان

یہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ آں سوے افلاک کے اِس شہ پارۂ ادب کا حسن بیان تو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مصنف نے، البتہ اِس ترجمے میں یہ کوشش کی ہے کہ اِس کا مدعا نظم کلام کی رعایت سے اردو زبان میں منتقل کر دیں۔ تراجم کی تاریخ میں یہ اِس لحاظ سے پہلا ترجمۂ قرآن ہے کہ اِس میں قرآن کا نظم اُس کے ترجمے ہی سے واضح ہو جاتا ہے۔ اِس کے لیے مزید کسی شرح و وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے حواشی زیادہ تر استاذ امام امین احسن اصلاحی کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ کا خلاصہ ہیں۔ مصنف کا نقطۂ نظر جن مقامات پر اُن سے مختلف ہے، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ اہل نظر تقابلی مطالعے سے اُنھیں خود متعین کر سکتے ہیں۔ ترجمہ و تفسیر کی کتابوں میں ہر جگہ اِس کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ نظم کلام کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان کا جلال و جمال بھی ارباب ذوق اِس ترجمے میں کسی حد تک جلوہ فرما دیکھ سکیں گے۔

میزان

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم و بیش ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق سے مصنف نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اِس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

المورد
ادارۂ علم و تحقیق